(معہ سوانح حیات)

ابوسعید بزمی (ایم۔اے)

مرتبہ۔ ایم۔ اے صمد

پیش لفظ

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، لیکن وہ عظیم شخصیت جس نے ملک اور بیرون ملک اپنی ذہنی صلاحیتوں کا سکہ جمایا، مسلم لیگی تربیت کی وجہ سے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کے لئے اجنبی ہی رہی سیاسی اغراض کو حاصل کرنے کے لئے مسلم لیگ نے مولانا مرحوم کو جس طرح بلیک میل کرنے کی ناپاک کوشش کی وہ مسلمانوں کی شاندار روایات کے لئے ایک المیہ کا درجہ رکھتی ہے۔

زیر نظر کتاب میں ابوسعید بزمی ایم۔اے نے حضرت مولانا کی شخصیت عام مسلمانوں کے سامنے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ فاضل مصنف مسلم ہندو اتحاد کے زبردست موید ہیں لیکن تعصب کی عینک ان کے پاس نہیں انھوں نے مولانا مرحوم کی شخصیت اور کردار کا گہرا مطالعہ کرکے یہ کتاب لکھی جو یقیناً مولانا مرحوم کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوئی ہوگی۔ چونکہ یہ کتاب تقسیم ہند سے پہلے لکھی گئی تھی اور جب سے اب تک حالات بہت کافی تبدیل ہو چکے ہیں۔ خود مولانا مرحوم ہم سے جدا ہو چکے ہیں۔ اس کتاب سے مولانا مرحوم کی مختصر سوانح حیات بھی اس میں شامل کردی گئی ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب ہر مکتب خیال کے لوگوں کے لئے فیض رساں ثابت ہوگی۔

ایم۔ اے صمد

قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ

تعداد طبع ایک ہزار

پرنٹر کوہ نور پریس دہلی :-

ناشر

ناز پبلشنگ ہاؤس اُردو بازار دھلی

عرب میں رہے۔ بعد میں سلطان عبدالحمید کی دعوت پر قسطنطنیہ چلے گئے۔ اور وہاں تین سال رہے۔ ۱۸۸۷ء میں انھیں مکہ کی نہر زبیدہ کی مرمت کا خیال پیدا ہوا۔ جو ملکہ زبیدہ کے نام پر بنائی گئی تھی۔ چنانچہ ان کی ذاتی کوششوں سے اس کام کے لئے گیارہ لاکھ روپیہ چندہ اکٹھا ہوگیا۔ آخر ۱۹۰۷ء میں اپنے مریدوں کی دعوت پر وہ کلکتہ چلے آئے۔ اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کی اکثر کتابیں جو مصر میں چھپی ہیں دینی مباحثات میں قابل قدر اضافہ کا موجب سمجھی جاتی ہیں۔

مولانا آزاد کی پیدائش اور تعلیم

مولانا ابوالکلام آزاد جن کا اصل نام احمد تھا ستمبر ۱۸۸۸ء میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد انھیں فیروز بخت بھی پکارتے تھے۔ آپ کا بچپن مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بسر ہوا۔ مدینہ میں ان کے والد کا مکان دینی تعلیم کا ایک بہت بڑا مرکز تھا۔ ابتدائی تعلیم آپ نے والد سے حاصل کی۔ آپ نے قاہرہ کی مشہور عالم یونیورسٹی الازہر میں بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ چودہ سال کی عمر میں آپ نے جامعہ الازہر میں علوم مشرقی کا تمام نصاب پورا کر لیا تھا۔ اور اس قدر استعداد پیدا کر لی تھی کہ آپ کو مختلف مضامین پڑھانے پر مامور کر دیا گیا تھا۔ اس چھوٹی سی عمر میں آپ کا تبحر علمی لوگوں کو تعجب میں ڈال دیتا تھا۔ ان کی تیز فہمی اور ذوق مطالعہ جس کی بے پناہی خاندانی ماحولی تعصبات پر غالب تھی انگشت نمائی کر رہی تھی کہ یہی شخص ہے جو ہر اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے جس میں اعلیٰ پایہ کا عزم و استقلال اور دیانت و عقل درکار ہے۔ آپ ایک ایسے خاندان میں

۷۸۶

امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ کی سوانح عمری

مولانا کا سلسلۂ نسب

مولانا آزاد کا سلسلۂ نسب شیخ جمال الدین ؒ سے ملتا ہے جو ایک بہت بڑے فاضل اور عالم دین بزرگ تھے۔ ایران اور افغانستان کے دوسرے بہت سے صاحب کمال لوگوں کی طرح دربار اکبری کی علم دوست فضا انھیں بھی ہندوستان لے آئی۔ ان کے استقلال اور راست بازی کا اعتراف خود شہنشاہ اکبر کو بھی تھا۔ اور مرزا عزیز انھیں بہت زیادہ عزیز جانتے تھے آپ ان معدودے چند آدمیوں میں سے تھے۔ جنہوں نے عہد اکبری کے مشہور عالمان دین کے اس فتوے پر دستخط کرنے سے انکار کیا جس کے ذریعہ اکبر "دین الٰہی" کا بانی تسلیم کیا گیا تھا۔ ننہال اور ددہال دونوں طرف مولینا آزاد کا سلسلۂ نسب نامور عالمان دین اور نیک طینت و قابل احترام بزرگوں سے ملتا ہے۔ آپ کی والدہ مدینہ منورہ کے ایک معزز گھرانے سے تھیں۔ مولانا کے اسلاف میں سے اکثر علماء دین تھے۔ جنہیں دبدبہ شاہی سے اپنی آزادی ضمیر محفوظ رکھنے کے لئے اپنا وطن چھوڑ کر صحرائے عرب میں پناہ لینی پڑی۔ آپ کے والد کو بھی ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ اور وہ کئی سال

الہلال کا اجراء

مولانا آزاد کی سیاسی زندگی اگرچہ بعد میں شروع ہوئی۔ تاہم اس کا سلسلہ
قطعی طور پر ۱۹۱۲ء سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ انھوں نے اپنے اخبار "الہلال"
میں اپنے سلجھے ہوئے خیالات کا اظہار شروع کیا۔ "الہلال" ہندوستان میں اپنی
طرز کا واحد پرچہ تھا جو اپنی ترتیب و مواد کے لحاظ سے اس وقت کے بلند پایہ انگریزی
اخبارات سے لگا کھاتا تھا۔ مولانا آزاد نے تخیل اور انداز بیان دونوں میں ترقی
اور جدت کا ثبوت دیا اور پامال اور فرسودہ راہوں سے ہٹ کر نئی راہ اختیار کی۔
آپ نے اردو میں ایک ایسے انداز کی بنا ڈالی جس نے پچھلے تیس سال میں لاتعداد آدمیوں کو
متاثر کیا ہے۔ آپ کو یقین ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کے لئے تصورات میں انقلاب کی
فوری ضرورت ہے۔ چنانچہ آپ نے الہلال کے ذریعہ یہ کام شروع کر دیا۔ یہ وہ زمانہ
تھا۔ جب کہ مولینا نے سیاسی [illegible] کے ساتھ ساتھ مذہبی مسائل پر پند و
موعظت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مولانا کے ان مواعظ نے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو
جو ایک فرسودہ عقائد پرستی سے تنگ آ گئے تھے۔ ایک نئے ولولہ مذہبی سے سرشار
کر دیا۔ انھوں نے دینی مباحث میں عقلی نکتہ چینی اور منطقی بحث کی طرح ڈالی۔
علامہ اقبال کی طرح انھوں نے ہندوستان کے اکثر تعلیم یافتہ مسلمانوں کو زندگی
کے اہم و بنیادی مسائل پر غور و فکر کا عادی بنا دیا۔

الہلال کو دو تین مہینوں میں ہندوستان کے مسلمانوں میں جو مقبولیت
حاصل ہوئی اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ پرچہ ترقی پسند سیاسی تخیلات اور

پیدا ہوئے جس کی مذہبی قدامت پسندی ضرب المثل تھی۔ لیکن ان کی فطرت آزاد نے پرانے ڈھرے پر چلنا گوارا نہ کیا اور انھوں نے زندگی کے ہر پہلو کا نئے سرے سے جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس انقلاب ذہنی کی پہلی جھلک ان کی خود نوشتہ سوانح عمری " تذکرہ " میں ملتی ہے یہ کتاب انھوں نے تیس برس کی عمر میں اپنی نظر بندی کے ایام میں لکھی تھی۔ اس میں آپ لکھتے ہیں :۔

پہلا ادبی کارنامہ

ان کی ادبی زندگی ۱۵ سال کی عمر سے شروع ہوئی۔ اس وقت آپ نے "لسان الصدق" کے نام سے ایک ماہوار جریدہ نکالا جس کی مولینا الطاف حسین حالی مرحوم نے بہت تعریف کی تھی۔ ۱۹۰۴ء میں مولانا آزاد سے ملے تو انھیں یقین نہ آیا کہ ۱۶ سال کا یہ لڑکا "لسان الصدق" جیسے بلند پایہ اخبار کا ایڈیٹر ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کا شک بہت جلد دور ہو گیا۔ اور وہ زندگی بھر مولینا کے کمال علمی کے معترف و مداح رہے۔ مولانا نے چودہ سال کی عمر میں مولانا شبلی سے خط و کتابت شروع کر دی تھی۔ اور لاہور کے مشہور رسالہ "مخزن" میں مضمون بھی لکھے ۱۹۰۲ء میں آپ کو بمبئی میں مولینا شبلی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ مولینا شبلی نے انھیں مولانا آزاد کا بیٹا سمجھا اور کہا کہ آپ کے باپ کے فضل و کمال کے کیا کہنے ہیں۔ نواب محسن الملک مولینا آزاد کو ہمیشہ ان الفاظ سے مخاطب کرتے تھے " خورد سال مگر پختہ کار۔"

⁂ ⁂ ⁂

اس پایہ کا اخبار نکالنے کی کوشش کی لیکن وہ بات پیدا نہ ہوسکی۔ حکومت نے ۱۹۱۵ء میں اس پارۂ آتش کی چنگاریاں سرد کردیں لیکن مولینا آزاد کا کمال آزاد "البلاغ" میں پھر پھوٹ نکلا۔ یہ اخبار مولانا نے الہلال بند ہوجانے کے بعد جاری کیا۔ ابھی اسے جاری کئے ہوئے کچھ مہینے ہی ہوئے تھے کہ اپریل ۱۹۱۶ء میں حکومت بنگال نے مولینا کو صوبہ بدر کردیا۔ پنجاب، یو۔ پی، بمبئی اور دوسرے صوبوں کی حکومتوں نے پہلے ہی ان کا داخلہ بند کر رکھا تھا۔ لہٰذا مولینا آزاد کو رانچی میں پناہ لینی پڑی۔ جہاں پانچ مہینے بعد انھیں نظر بند کردیا گیا۔ آپ کو ۱۹۲۰ء میں رہا کیا گیا۔ آپ جنگ عظیم کے نظر بندوں میں سب سے آخر میں رہا ہوکر آئے تو ہندوستان بھر کے عالمان دین نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ دینی مسائل پر مولانا آزاد سے زیادہ صاف اور سلجھی ہوئی سوجھ بوجھ رکھنے والا اور کوئی شخص نہیں ہے۔ اور یہ کہ تمام مسلمانوں پر ان کا احترام واجب ہے۔ مولینا آزاد کی تحریروں اور تقریروں نے ہندوستانی مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ پر جو اثر ڈالا وہ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کے اندر بھی نمایاں ہونے لگا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں مسٹر سید وزیر حسن (بعد میں سر وزیر حسن) مسلم لیگ کے سکریٹری کی حیثیت میں مولانا آزاد سے ملے اور انھوں نے تجویز پیش کی کہ مسلم لیگ مطلق العنان برطانوی حکومت سے اندھی وفاداری کا نصب العین بدل کر مناسب قسم کی سلف گورنمنٹ کو اپنی منزل قرار دے۔ اس وقت کانگریس بھی بہت آگے نہ بڑھی تھی۔ اگرچہ دادا بھائی نارو جی نے ہندوستانی سیاست میں سوراج کا لفظ داخل کردیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے تھی کہ یہ کافی نہیں۔ تاہم مسلم لیگ کے لئے یہ چھلانگ بھی بہت بڑی تھی۔

عقل پر پوری اترنے والی مذہبی ہدایت کا گہوارہ اور بلند پایہ و سنجیدہ ادب کا نمونہ تھا۔ آج لوگ الہلال کی پرانی جلدوں کو بڑی احتیاط سے اپنے پاس رکھے ہوئے ہیں۔

علی گڑھ کے اسکول کا اثر

اس زمانہ کے تعلیم یافتہ مسلمان مذہب اور سیاسیات میں ارباب علی گڑھ کو اپنا قطعی رہنما سمجھتے تھے۔ ہر شخص جو ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی تخیلات کی تاریخ سے ذرا بھی واقف ہے اسے معلوم ہے کہ سرسید احمد خاں نے ایک مرتبہ کانگریس کے اجلاس میں شامل ہونے کے بعد اپنی تمام توجہ مسلمانوں کی تعلیم پر مرکوز کر دی۔ اور مسلمانوں کو سیاسیات سے کھینچ لے گئے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کے سیاسی خیالات کی نمائندگی کے لئے مسلم لیگ کی بنا ڈالی گئی۔ اس وقت مسلم لیگ کا اعلان کردہ مقصد مسلمانوں میں تاج برطانیہ سے وفاداری کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ برطانوی حکام کے نزدیک مسلم لیگ سرکاری حکمت عملی کی آلہ کار تھی۔ اور تو اور مولانا محمد علی کا مشہور اخبار "کامریڈ" بھی جو ۱۹۱۱ء میں کلکتہ میں جاری ہوا تھا شروع شروع میں ارباب علی گڑھ کا خوشہ چیں تھا۔

مولانا کی زبان بندی

۱۹۱۲ء سے لیکر ۱۹۱۵ء تک جب کہ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کی تلوار الہلال پر گری۔ یہ اخبار ہندوستان کے مسلمانوں میں اس قدر اثر و رسوخ کا مالک ہو گیا کہ آج تک اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اگرچہ بہت سے لوگوں نے

کا فیصلہ کیا اس وقت سیاسی مصروفیتوں کے علاوہ آپ اپنے ادبی مشاغل میں الجھے ہوئے تھے۔ ترجمان القرآن لکھا جا رہا تھا۔ اور دہلی کے ایک پریس میں اسکی طباعت ہو رہی تھی۔ لیکن وہ ان گوناگوں مصروفیتوں کی تاب نہ لا سکے۔ اور کلکتہ میں مستقل طور پر رہنے لگے۔ ترجمان القرآن ان کی مقبول ترین کتاب ہے۔ مولینا آزاد آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی میں اس کے آغاز سے شامل ہیں۔ لیکن انھوں نے مسلم لیگ اور دوسرے مسلم اداروں سے ناطہ توڑ لیا جب کہ ان کے معاملات ایسے گروہوں کے ہاتھوں میں چلے گئے جو انھیں اپنے رجعت پسندانہ مقاصد کا آلۂ کار بنانا چاہتے تھے۔

جب خلافت نے بھی اپنی سرگرمیوں کا میدان تنگ کر لیا تو مولینا نے اس سے بھی قطع تعلق کر لیا۔ لیکن جمعیۃ علمار ہند سے مولانا کا تعلق ابھی تک چلا آتا تھا۔ اور وہ عالمان دین کی اس بارسوخ جماعت سے میل جول کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ یہ جماعت مسلمانوں کے بارسوخ علمار دین کی جن کے پیروں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ جماعت ہے۔ اگرچہ مسلم لیگ علمار دین کی سیاسی سرگرمیوں سے بہت سیخ پا رہی۔ اور کئی بار ان کی مذمت کرتی تھی۔ اور انھیں اپنے ضمیر کی خاطر بہت سے مصائب برداشت کرنے پڑے۔ تاہم اس جماعت کو مسلمانوں میں جو اثر و رسوخ حاصل ہے۔ وہ اور کسی جماعت کے حصے میں نہیں آیا۔ تحریک خلافت کے عروج کے زمانہ میں جمعیۃ علمار ہند کا حکم مسلمانوں کے لئے قانون کا درجہ رکھتا تھا یہ ایک عجیب بات ہے کہ تمام اعتدال پسند و رجعت پسند لوگ جن کا اثر و رسوخ علمار نے خاک میں

گاندھی جی سے ملاقات

مولانا آزاد ۱۹۲۱ء میں گاندھی جی سے ملے وہ دن اور آج کا دن وہ عدم تشدد کے زبردست حامی چلے آتے تھے۔ آپ مسلم لیگ اور پُرانی آل انڈیا خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں مولانا قطعی طور پر پُرانی سوراج پارٹی میں شامل ہوگئے۔ آپ آنجہانی سی۔ آر۔ داس اور پنڈت موتی لال نہرو کے بارسوخ شریک کار تھے۔ ۱۹۲۳ء کی آخری سہ ماہی میں سوراجیوں اور تبدیلی کے مخالفوں میں سی۔ ڈی۔ او کمیٹی (سول نافرمانی ملتوی کرنے کے سوال پر غور کرنے کے لئے قائم کردہ کمیٹی) کی اقلیتی رپورٹ پر کش مکش چھڑ گئی۔ یہ کش مکش اس قدر شدت پکڑ گئی۔ کہ اسے سلجھانے کے لئے آل انڈیا کانگریس کا خاص اجلاس بلانے کا فیصلہ ہوا۔ ہندو کانگریسیوں کی طرح مسلم کانگریسیوں کے بھی فریق بن گئے۔ حکیم اجمل خاں مرحوم، مولانا آزاد اور بہت سے دوسرے لوگ سوراجیوں میں شامل ہوگئے۔ اور مولانا محمد علیؒ اور ڈاکٹر انصاری تبدیلی کے مخالفین (نوچینجرز) میں جا ملے۔ کانگریس کے اس تاریخی خاص اجلاس کے جو دہلی میں ہوا۔ مولانا آزاد صدر چنے گئے۔ اس اجلاس میں کانگریس نے پارلیمنٹری پروگرام سے پابندی اٹھادی اور سوراجیوں کو حکومت کی مخالفت کے لئے اسمبلیوں میں جانے کی اجازت دیدی گئی۔ اس وقت سے لے کر اب تک مولانا آزاد بڑی مضبوطی سے اس خیال پر قائم رہے کہ پارلیمنٹری اور غیر پارلیمنٹری پروگرام کو ساتھ ساتھ چلایا جائے۔ ۱۹۲۶ء میں مولانا آزاد نے دہلی اور کلکتہ دونوں جگہ پارٹی سکونت رکھنے

صحیح راستہ ہے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوں گے۔

انھوں نے کانگریس اور مسلم لیگ میں سمجھوتہ کرانے کی انتہائی کوشش کی۔ لیکن اس میں انھیں سخت مایوسی ہوئی اور لیگ کے مطلق العنان قائداعظم نے ہر مرتبہ ان کے دست تعاون کو جھٹک دیا۔ انھوں نے بعض سرکردہ لیڈروں سے بھی جو بعض وجوہ سے لیگ میں شامل تھے بات چیت کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ موجودہ وقت کی تخریبی کش مکش میں کوئی تعمیری تجویز پیش کریں لیکن ہر بار انھیں جواب ملا کہ مسلم لیگ کی ہائی کمانڈ کے خیال میں ابھی اس کے لئے وقت نہیں آیا۔

پرانی سوراج پارٹی کے احیاء کی کوشش

۳۴-۱۹۳۳ء میں جب ڈاکٹر انصاری کی لیڈری میں سوراج پارٹی کو دوبارہ زندہ کرنے کی تجویز پیش ہوئی تو مولانا نے پارلیمنٹری پروگرام کی پورے زور سے حمایت کی چنانچہ آپ کو ۱۹۳۵ء کے آخر میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی پارلیمنٹری سب کمیٹی کا رکن منتخب کیا گیا۔

مولانا کا طبعی رجحان

ورکنگ کمیٹی اور گاندھی جی پر آپ کا بھاری اثر رہا ہے۔ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کے اٹھ جانے کے بعد کانگریسی حلقوں میں ہندوستانی مسلمانوں کے معاملات میں آپ کی رائے بہت وزن رکھتی تھی۔ مولانا سیاسی ہنگاموں اور مظاہروں سے دور رہنا چاہتے۔ وہ ایک گوشہ میں بیٹھ کر ٹھوس کام کئے جانا

ملا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اسلام کے نام پر مسلم لیگ میں شور کرتے رہے اور مسلمانوں کے خطرہ کا نعرہ بلند کرتے رہے ہیں لیکن مولانا آزاد ہیں کہ ان کے پائے استقلال میں شروع سے لے کر اب تک ذرا بھی لغزش نہیں آتی تھی۔ وہ اسلام کی حقیقی اسپرٹ پر کاربند رہے ۔ اسلام صحیح قسم کی وطنیت سکھاتا ہے اور اس تنگ نظری و تعصب کا دشمن ہے جو نسلی یا قبائلی عصبیت کی پیداوار ہے۔ مولانا بڑی سختی اور مضبوطی کے ساتھ اسلام کی قدیم روایات اور پرانے اصولوں پر قائم رہے۔ اور دنیا کی کوئی طاقت نہیں جو ان کے قدم ڈگمگا سکے۔ ان کے پیش نظر رسول عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بلند مثال تھی جنہیں مشرکین عرب نے بتوں کی مذمت ترک کرنے کے سلسلہ میں تخت و تاج کی پیش کش کی۔ تو آپ ؐ نے فرمایا: "اگر تم لوگ چاند اور سورج بھی لاکر میرے ہاتھ پر رکھ دو تو بھی میں راہ راست سے نہیں ہٹوں گا۔" مولانا کے لئے اس سے آسان اور سہولت کی کیا چیز ہو سکتی تھی۔ کہ وہ مقابلہ اور جدوجہد کے میدان سے ہٹ کر ابن الوقتی کے دھڑے پر چل نکلیں۔ جیسا کہ ان سے کمتر درجہ کے اکثر مسلمان لیڈر کر رہے تھے۔ اگر وہ آج اپنے اصولوں کو خیرباد کہہ دیں۔ تو وہ ایک دن میں ۹ کروڑ مسلمانوں کے امام اور مفتی اعظم بن کے مخالفوں کو ان کے اپنے حربے سے شکست دے سکتے تھے۔ لیکن وہ جانتے ہیں کہ اپنے وطن کے کروڑوں مسلمانوں کے تئیں ان پر کیا فرض عائد ہوتا تھا۔ اور وہ ہزار ہا مصیبتوں کے باوجود قوم و ملک کے اہم مفاد کی پاسبانی کر رہے تھے۔ اگر ان کی ساری قوم گمراہ دبے اصول لوگوں کے بہکائے میں آکر ان کا ساتھ چھوڑ دیتی۔ اور وہ تنہا رہ جاتے تب بھی وہ اس راستہ سے جس کے بارے میں انھیں یقین تھا۔ کہ وہ

کے شکوک رفع کرائے جاتے تھے۔ مولانا ان کی باتیں صبر و سکون سے سنتے تھے جو ان کی حساس طبیعت کے آدمی کے لئے واقعی حیرت انگیز بات تھی۔ ان کے مزاج میں اس قدر شائستگی اور رواداری تھی کہ ان کے دشمنوں کو بھی ذاتی طور پر ان سے شکایت کی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی۔ شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو جس نے انھیں غصہ میں دیکھا ہو۔ طویل سفر یا مصروف دن گذارنے کے بعد ترکی حمام بہت مرغوب تھا۔ اگرچہ مولینا فیشن ایبل لوگوں کی صحبت میں گم سُم بیٹھے رہتے تھے۔ تاہم وہ اپنے حلقہ احباب میں کھُل جاتے تھے۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کبھی کبھی سیر کو نکل جاتے تھے اور سیاست کے ہنگاموں اور جھگڑوں سے ان کے لئے یہی ایک راہ فرار تھی۔ ان کے پاس تازہ ترین انگریزی اور مشرقی زبانوں کی کتابوں اور ایران۔ افغانستان۔ عرب۔ ترکی اور مصر کے اخبارات کا بہت بڑا ذخیرہ تھا لباس سادہ مگر ستھرا رکھتے تھے۔ اپنے بارے میں ان کی کم گوئی ان کے دوستوں کو بہت پریشان رکھتی تھی۔ دوست لاکھ کوشش کریں۔ یہ اپنے ذاتی معاملات اپنی ذات تک ہی محدود رکھتے تھے۔

اس مختصر مضمون میں مولنا آزاد کی شخصیت سے متعلق تمام چیزوں کا مجمل بیان میں بھی نہیں آسکتا۔ ان کی ذات گنجینۂ صفات تھی۔ ان کی بلند و برتر شخصیت ایک مینار رہنما کی طرح کھڑی تھی۔ اور لوگ سیاسی تعصبات سے اندھے ہو کر لاعلمی سے یا انتقام کے جذبے کے ماتحت ان کی اہمیت گھٹانا چاہیں تو یہ ان ہونی بات ہوتی۔ غیر مسلم حلقوں میں وہ اپنی سیاسی عقائد و سرگرمیوں کی وجہ سے مشہور تھے لیکن اس سے بھی بڑھ چڑھ کر اوصاف و اہلیتیں تھیں

پسند کرتے تھے۔ مولانا اُردو زبان کے بہترین مقرر و خطیب تھے۔ ان کی تقریر میں خطیبانہ زورِ کلام ہوتا تھا۔ چچے تلے فقرے۔ ترشی ترشائی زبان اور روانگی اس بلا کی کہ الفاظ و معنیٰ کا ایک دریا موجیں مارتا دکھائی دیتا تھا جلسہ عام میں ان کی تقریر سنکر یوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا کوئی شخص مرصع نظم پڑھ کے اٹھ گیا ہے لیکن اس کی مترنم بازگشت فضاؤں میں لبی ہوئی ہے۔ ان کی تقریر سننے کے لئے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے لیکن مولانا بھیڑ بھڑکے سے کتراتے تھے۔ لہٰذا وہ اکثر بڑے بڑے جلسوں میں تقریر کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔ مولانا کے اس حد سے بڑھے ہوئے حجاب کو اکثر سطح بیں لوگ تجاہلِ عارفانہ یا انانیت سمجھ لیتے تھے۔

مولٰنا ایک حساس دل اور عقاب کی سی تیز نگاہ رکھتے تھے۔ ان کی ذہانت تلوار کے جوہر اور بذلہ سنجی خنجر کی کاٹ رکھتی تھی۔ مردم شناسی مولانا کا ایک خاص وصف تھا لیکن خود اس طرح کٹ کے رہتے تھے کہ لوگ ان کے بارے میں آسانی کے ساتھ کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے تھے۔ یاران زندہ دلی کی صحبت میں ان کا شستہ مزاج اور حاضر جوابی ساری محفل پر چھا جاتی۔ جب وہ اپنے رنگ میں نہ ہوتے تو پھر ایسی چُپ سادھ لیتے تھے کہ کوئی بات ان کی زبان نہیں کھلوا سکتی تھی۔ وہ مناظرہ کے میدان کے شیر تھے۔ اور مباحثات میں مخالفوں کو بھی قائل کر دیتے تھے۔ کیونکہ وہ اپنے وسیع مطالعہ سے پورا کام لیتے تھے۔ مولٰنا کی پابندی اوقات حیرت انگیز تھی۔ وہ علی الصباح ۵ بجے بستر سے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ پو پھٹتے ہی ملاقاتیوں کا تانتا بندھ جاتا تھا اور دوپہر تک وہ بڑی مشکل سے آشنا و ناآشنا ملاقاتیوں سے فارغ ہوتے تھے۔ بعض اوقات لوگ نازک مسائل پر بات کرنے یا عجیب و غریب قسم

آپ کو رہا کر دیا گیا۔ مگر کرپس اسکیم کو کانگریس نے ٹھکرا کر جنگ آزادی شروع کرنے کی تیاری شروع کی۔ اور بالآخر ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں گوالیا رینک میں کانگریس نے کوئٹ انڈیا کا تاریخی ریزولیوشن پاس کر دیا جس سے قصر بکنگھم تک لرز اٹھا۔ اور برطانوی حکومت یہ سمجھ گئی کہ اب ہندوستان کی اس انقلابی تحریک کو اگر نہ کچلا گیا تو نہ صرف برطانیہ کے ہاتھ سے ہندوستان نکل جائے گا۔ بلکہ برطانیہ جنگ بھی ہار جائے گا۔

چنانچہ ۹ اگست ۱۹۴۲ء کی صبح کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبران اور مولانا کو گرفتار کر کے قلعہ احمد نگر میں مقید کر دیا گیا۔ آپ احمد نگر کے قلعہ میں مقید تھے۔ کہ بیگم آزاد ۹ اپریل ۱۹۴۳ء کو راہی ملک عدم ہوئیں۔ احمد نگر سے مولانا کو اپریل ۱۹۴۵ء میں بانکوڑ (بنگال) میں منتقل کر دیا گیا۔ جہاں سے آپ ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو رہا ہوئے تھے۔ ۲۰ جون ۱۹۴۵ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کا بمبئی میں اجلاس ہوا جس میں آپ کو اور گاندھی جی کو اختیار دیا گیا۔ ۲۵ جون ۱۹۴۵ء کو شملہ میں پہلی کانفرنس شروع ہوئی۔ مگر ۱۲ جولائی کو وہ ناکامی کے ساتھ ختم ہو گئی کرپس مشن کے بعد برطانوی حکومت سے یہ دوسری گفت و شنید ہوئی مگر یہ بھی ناکام رہی۔ اس کے بعد برطانوی پارلیمنٹری وفد ہندوستان کے دورہ پر آیا۔ جس سے ۱۷ جنوری ۱۹۴۶ء کو نئی دہلی میں آپ نے ملاقات کی۔

اس کے بعد ۱۵ مارچ کو مسٹر اٹیلی وزیر اعظم برطانیہ نے ہندوستان کے بارے میں اعلان آزادی کیا۔ ۲۳ مارچ کو وزیر ہند لارڈ لارنس کی سرکردگی میں دو اور وزیروں پر مشتمل ایک وفد جس میں سر اسٹیفورڈ کرپس اور مسٹر اے۔ وی

جنھوں نے ان کی شخصیت کو ایک ایسی بزرگی و بلندی عطا کردی تھی جو عقل و فہم کی دنیا میں شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔ مولانا کو ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ وہ سیاسی جھنجھٹوں سے فرصت پاکر اپنی زندگی قلم و دوات کی صحبت میں بسر کریں۔ لیکن سیاسی حالات کی نزاکت ان کے سامنے اس قدر نمایاں تھا۔ اور کروڑوں مجبور عوام کی مزوریات کا انھیں اس قدر شدید احساس تھا کہ وہ اپنے دل کے محبوب ترین ارمانوں کو قربان کردیا۔ لیکن اس مدلے عمل پر جس کا غلغلہ آج ہندوستان کے طول و عرض میں بلند ہے۔ بیبک کہے بغیر نہیں رہ سکے۔ کوئی شخص جوان سے واقف ہے ان کی دلآویز شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

کانگریس کی صدارت

۱۵ر فروری ۱۹۴۰ء کو کانگریس کی صدارت کا الیکشن ہوا۔ اور آپ کے حریف مسٹر ایم۔ این رائے کو ۱۸۶۴ کے مقابلہ میں کل ۱۸۳ ووٹ ملے۔ اور ۲۰ ر ۲۱ ر مارچ کو رام گڈھ میں مولینا آزاد نے کانگریس کی صدارت کا چارج لیا تھا۔ آپ کا دور صدارت کانگریس کی تاریخ میں انتہائی نازک اور سب سے زیادہ طویل رہا۔ اور آپ کے دور صدارت اور آپ کی ہی قیادت میں کانگریس نے آزادی وطن کی فیصلہ کن اور آخری لڑائی لڑی تھی۔

آپ کی صدارت میں کانگریس نے سب سے پہلے انفرادی ستیہ گرہ شروع کی تھی اور اس کے سلسلہ میں ۲ر جنوری ۱۹۴۱ء کو آپ دہلی سے کلکتہ جاتے ہوئے گرفتار کرلئے گئے تھے۔ مگر سر اسٹیفورڈ کرپس کی آمد پر ۴ر دسمبر ۱۹۴۱ء کو

مولانا آزاد کے متعلق ہندوستان کے مسلمانوں نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے قبل جو فیصلہ کیا تھا اب وہ بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں۔ آج انھوں نے محسوس کر لیا ہے کہ انھوں نے مولانا آزاد کو سمجھنے میں غلطی کی تھی اور مولانا آزاد ان کے صحیح رہنما تھے۔ انھوں نے جو راہ بتائی تھی وہ نہ صرف صحیح تھی بلکہ اس پر چل کر مسلمان اپنی جان و مال کو محفوظ رکھ سکے۔ بلکہ ہندوستان میں باعزت زندگی بسر کر رہے ہیں۔

مولانا آزاد کی زندگی کا ایک رُخ ہماری نظروں کے سامنے دہلی کے فسادات کے دوران میں آیا۔ اور ہم نے دیکھا کہ وہ مسلمانوں کے لئے کس قدر بے چین رہے ہیں۔ اگر مولانا آزاد اس وقت جبل استقامت بن کر اپنی راہ پر نہ ڈٹے رہتے اور ان کے پائے استقلال ڈگمگا جاتے تو آج ہندوستان سے مسلمانوں کا نام اسی طرح مٹ جاتا جس طرح ہسپانیہ سے۔ بلاشبہ تمام قدرت باری تعالیٰ کو ہے۔ مگر اس کے لئے ذرائع اور وسائل بھی ہوتے ہیں۔ اور مولانا آزاد اس کے لئے ایک وسیلہ اور ذریعہ ثابت ہوئے۔

مولانا کی وفات

مفسر قرآن پیشوا اعظم امام الہند محی الدین احمد عرف فیروز بخت ابو الکلام آزاد نے ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء بروز ہفتہ ۲ بجکر ۱۵ منٹ (صبح) داعی اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ؕ

مزار مبارک:۔ جامع مسجد شاہجہانی اور دلی کے تاریخی لال قلعہ کے درمیان پریڈ گراؤنڈ میں واقع ہے۔

الیگزینڈر شامل تھے۔ ہندوستان پہونچا۔ اور ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے لیڈروں سے گفت وشنید شروع کی۔ مولانا آزاد کی اس برطانوی وفد سے ۳ اپریل کو ملاقات ہوئی۔ اسی گفت وشنید کے سلسلہ میں ایک اور شملہ کانفرنس ۵ مئی کو شملہ میں شروع ہوئی جو ۸ مئی کو ختم ہوگئی اور اس کے بعد ۱۶ مئی کو وزارتی مشن کی اسکیم کا ہندوستان اور انگلستان میں بیک وقت اعلان ہوا۔

اسی وزارتی مشن کے پلان کے نتیجے میں ۲۴ اگست ۱۹۴۶ء کو ہندوستان میں ایک عارضی حکومت وجود میں آئی۔

ہند کی وزارت میں

یہ تھے وہ اہم واقعات جو مولانا آزاد کے دور صدارت میں پیش آئے۔ مولانا آزاد کا دور صدارت سب سے طویل تھا۔ آپ چھ برس تک صدر رہے اور جنگ آزادی کے تمام مراحل ہندوستان نے آپ کی صدارت میں طے کئے۔ بقول شخصے ہندوستان کی سیاست کے بڑے عقدے آپ کے ہی ناخن تدبیر سے حل ہوئے ہیں۔ آپ کے بعد پنڈت نہرو کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ اور ۶ جولائی ۱۹۴۶ء کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں پنڈت نہرو نے مولانا آزاد سے کانگریس کی صدارت کا چارج لیا۔

جب انٹریم گورنمنٹ بنائی گئی تو پنڈت نہرو نے مولٰینا ابوالکلام آزاد کو بحیثیت وزیر تعلیم اپنی کابینہ میں شامل کیا۔ اور حضرت مولانا اپنے آخری سانس تک اس عہدہ پر فائز رہ کر ملک کی بیش بہا خدمات انجام دیتے رہے۔

دُورافتادہ صدا

سچ پوچھو تو اب میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گزاری ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لئے چن لیا تھا وہاں میرے بال و پر کاٹ دئے گئے ہیں۔ یا میرے آشیانے کے لئے جگہ نہیں رہی بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمھاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی ہے۔ اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی تم نے کونسی راہ اختیار کی۔ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں اور کیا تمہارے حواس میں اختلال نہیں آگیا۔ یہ خوف تم نے خود فراہم کیا ہے یہ تمہارے اپنے ہی اعمال کے پھل ہیں۔

مرض الموت

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا۔ جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیات معنوی کے لئے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کر رکھا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں۔ لیکن تم نے سُنی اَن سُنی برابر کر دی اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی رفتار تمہارے لئے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار تھمی نہیں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہارا بھروسہ تھا وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے ہیں۔ وہ تقدیر جو تمہارے دماغی لغت میں مشیت کی منشا سے مختلف مفہوم رکھتی ہے۔ یعنی تمہارے نزدیک عام طور پر فقدانِ ہمت کا نام تقدیر ہے۔

❖ ❖ ❖

۱۹۴۷ء کے ہنگامی دور کی تاریخی تقریر

عزیزانِ گرامی! آپ جانتے ہیں کہ وہ کونسی زنجیر ہے جو مجھے یہاں لے آئی۔ میرے لئے شاہجہاں کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع نیا نہیں۔ میں نے اس زمانے میں بھی کہ اس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں، تمہیں یہیں خطاب کیا تھا۔ جب تمھارے چہروں پر اضمحلال کی بجائے اطمینان تھا۔ اور تمھارے دلوں میں شک کی بجائے اعتماد۔ آج تمھارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار پچھلے چند سالوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ تمہیں یاد ہے میں نے پکارا اور تم نے میری زبان کاٹ لی میں نے قلم کو ہاتھ میں اٹھایا۔ اور تم نے میرے ہاتھ قطع کر لئے۔ میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیئے۔ میں نے کروٹ لینا چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات سال کی "تلخ نوا سیاست" جو آج تمہیں داغ جدائی دے گئی ہے۔ اس کے عہدِ شباب میں، میں نے کبھی تمہیں خطرے کی ہر شاہراہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج انھیں خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے جن کا اندیشہ تمہیں صراطِ مستقیم سے دور لے گیا تھا۔

❖ ❖ ❖

وقت کی انگڑائی

یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمھاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی۔ بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی ہے۔ اور یہی وہ انقلاب ہے جس کی ایک کروٹ نے تمہیں بہت حد تک خوف زدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شئے چھن گئی۔ اور اس کی جگہ بری شئے آ گئی۔ یہ واقعہ نہیں واہمہ ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ بری شئے چلی گئی۔ اور اچھی شئے آ گئی۔ ہاں تمھاری بیقراری اس لئے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شئے کے لئے نہیں کیا تھا اور بری شئے ہی کو ملجاو ماویٰ سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا جب تم کسی جنگ کے آغاز کی فکر میں تھے۔ اور آج اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر تمھاری اس عجلت پر کیا کہوں کہ ادھر ابھی سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور ادھر گمرہی کا خطرہ بھی پیش آ گیا ہے۔

دعوت انقلاب

میں نے ہمیشہ تمہیں کہا اور آج پھر کہتا ہوں۔ کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو۔ شک سے ہاتھ اٹھا لو۔ اور بدعملی کو ترک کر دو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے۔ جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمھارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہیں۔ یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے اس پر بھی غور کرو۔ تمھیں محسوس ہو گا کہ یہ غلط ہے۔ اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ۔ اپنے دماغ کو سوچنے کی عادت ڈالو۔ اور پھر دیکھو کہ تمھارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں

بساط الٹ گئی

انگریز کی بساط تمھاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی اور راہ نمائی کے وہ بُت جو تم نے وضع کئے تھے وہ بھی دغا دے گئے۔ حالانکہ تم نے یہی سمجھا تھا۔ کہ یہ بساط ہمیشہ کے لئے بچھادی گئی ہے۔ اور ان ہی بتوں کی پوجا میں تمھاری زندگی ہے۔ تمھارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں۔ لیکن اگر کچھ دور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ تو تمھارے لئے بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں۔ ایک وقت تھا میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمہیں پکارا تھا اور کہا تھا۔

جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے روک نہیں سکتی ہندوستان کی تقدیر میں بھی سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے۔ اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانے سے پہلو تہی کی اور تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا تو مستقبل کا مورخ لکھے گا کہ:۔ تمہارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا۔ ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا جو صفحۂ ہستی سے محو ہو جانیوالی قوموں کا شیوا ہوا کرتا ہے۔ آج ہندوستان آزاد ہے۔ اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ وہ سامنے لال قلعہ کی دیوار پر آزاد ہندوستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دلآویز قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔

❊ ❊ ❊

حرفِ شکایت

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں لیکن مجھے
تمھاری تغافل کیشی کے پیش نظر بار بار کہنا پڑتا
ہے کہ تیسری طاقت اپنے گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے۔ جو ہونا تھا وہ
ہو کر رہا ہے سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی۔ اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا
ہے۔ اگر اب بھی تمھارے دلوں کا معاملہ بدلا نہیں۔ اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوئی
تو حالت دوسری ہے۔ لیکن اگر واقعی تمھارے اندر سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہو گئی ہے
تو پھر اسی طرح بدلو جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے۔ آج بھی کہ ہم ایک
دورِ انقلاب کو پورا کر چکے ہیں۔ ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں۔ اور ہم
ان ہی صفحوں میں زیبِ عنوان بن سکتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لئے
تیار بھی رہیں۔

سورج کی کرنیں چھین لو

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو،
یہ نہ کہو کہ ہم تغیر کے لئے تیار نہ تھے
بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے
کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو، جہاں اجالے کی سخت ضرورت
ہے۔ میں تمھیں یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا
سرٹیفکیٹ حاصل کر لو۔ کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو۔ جو غیر ملکی حاکموں کے
عہد میں تمھارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں جو اُجلے نقش و نگار تمھیں اس ہندوستان
میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں وہ تمھارا ہی قافلہ لایا تھا انھیں بھلاؤ
نہیں، انھیں چھوڑو نہیں۔ ان کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے

آخر کہاں جا رہے ہو؟ اور کیوں جا رہے ہو؟ یہ دیکھو مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا۔ اور آج تم ہو کہ یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

بیجا جوش اور بیجا ہراس

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو۔ جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمہارا جوش بیجا تھا اسی طرح آج تمہارا یہ خوف و ہراس بھی بیجا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے سچے مسلمان کو نہ کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں۔ انھوں نے تمہیں جانے ہی کے لئے اکٹھا کیا تھا۔ آج انھوں نے تمہارے ہاتھ میں سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو یہ تعجب کی بات نہیں، یہ دیکھو کہ تمہارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہیں تو ان کو اپنے اس خدا کی جلوہ گاہ بناؤ۔ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک اُمی کی معرفت فرمایا تھا۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ہُمْ یَحْزَنُوْنَ ط جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لئے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم۔ ہوائیں آتی ہیں اور گذر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی۔ لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلاء کا یہ موسم گذر جانے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔

انڈیا ونز فریڈم

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال کو ابھی ایک سال نہ گذرا تھا کہ ہندوستان کی سیاسی فضا میں ایک دھماکہ ہوا۔ مولانا آزاد کے ایک قریبی ساتھی اور مرکزی حکومت میں شعبہ سائنس اور کلچر کے وزیر مسٹر ہمایوں کبیر نے انگریزی میں ترجمہ کر دیا تھا۔ اور خود ان کے قول کے مطابق مولانا مرحوم نے ہی یہ کتاب مرتب کرائی تھی اور مسٹر کبیر اس کے صرف مترجم ہیں۔

کتاب کے شائع ہوتے ہی ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مولانا آزاد نے اپنی اس کتاب میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ کانگرس ملک کی تقسیم کو روک سکتی تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے مسٹر نہرو اور خاص طور سے سردار پٹیل کو تقسیم کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ مولانا آزاد کا خیال تھا کہ کانگرسی لیڈران کے لئے تقسیم کے مطالبہ کو ٹھکرانا آسان تھا لیکن انھوں نے چند معمولی واقعات سے گھبرا کر تقسیم قبول کر لی۔

جنگ آزادی کے ایک مقتدر رہنما ہونے کی حیثیت سے مولانا آزاد حالات کو بہتر طریقہ پر سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے جنگ آزادی کے زمانے میں پیش آنے والے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کانگرس کی بہت سی کمزوریوں کا اظہار کیا ہے۔ جن دنوں کانگرس کے دیگر رہنما تقسیم کے سوال پر سنجیدگی سے غور کر رہے

لئے تیار نہیں تو پھر تمہیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی ۔ آؤ عہد کرو کہ ملک ہمارا ہے ۔ ہم اس کے لئے ہیں ۔ اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے ۔ آج زلزلوں سے ڈرتے ہو کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے ۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو کیا یاد نہیں رہا کہ تمھارا وجود ایک اُجالا تھا یہ بادلوں کے پانی کی سیل کیا ہے کہ تم نے بھیگ جانے کے ڈر سے اپنے پائنچے چڑھائے ہیں وہ تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اتر گئے ۔ پہاڑوں کی چوٹیوں کو روند ڈالا بجلیاں آئیں تو ان پر مسکرا دے ۔ بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا ۔ صرصر اٹھی تو رُخ پھیر دیا ۔ آندھیاں آئیں تو ان سے کہا تمہارا یہ راستہ نہیں ہے ۔ یہ ایمان کی جان کنی ہے ۔ کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبانوں کے تار بیچ رہے ہیں ۔ اور خدا سے اس قدر غافل ہو گئے ہیں جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا ۔

عزیزو! ۔ میرے پاس تمھارے لئے کوئی نیا نسخہ نہیں چودہ سو برس پہلے کا پُرانا نسخہ ہے جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا ۔ اور وہ نسخہ قرآن کا یہ اعلان ہے ۔ لَا تھنوا لا تفرقوا نتم الاعلون ان کنتم مومنین

آزاد کی رائے کتنی صحیح تھی تقسیم نہ ہوتی تو شاید کچھ گڑبڑ ہوتی لیکن اتنی خوفناک کبھی نہ ہوتی جتنی ۱۹۴۷ء میں ہوئی اور پھر نفرت کا وہ طوفان کبھی پیدا نہ ہوتا جو تقسیم کے نتیجہ کے طور پر آج بھی عوام کے لئے تباہی کا باعث بنا ہوا ہے۔ لیکن افسوس تو یہ ہے دیگر کانگرسی زعما کی نظر ان خطرات کو نہ دیکھ سکی۔ اب تو خود پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک پریس کانفرنس میں اعتراف کیا ہے "کہ تقسیم کا مطالبہ تسلیم کرتے وقت ہمیں ان افسوسناک واقعات کا خطرہ محسوس نہ ہوا تھا جو بعد میں پیش آئے۔"

بہرحال تاریخ نے مولانا آزاد کی رائے کی اہمیت کو ثابت کر دکھایا ہے۔ اور (خود مولانا مرحوم کے الفاظ میں)

"تاریخ ہی یہ فیصلہ کرے گی کہ ہم نے تقسیم کو قبول کرکے کوئی دانشمندانہ اقدام کیا ہے۔"

تھے۔ مولانا آزاد اس بات پر مصر تھے کہ تقسیم کا مطالبہ بالکل رد کر دینا چاہیئے۔ انھوں نے ان افسوسناک واقعات کی طرف پہلے ہی اشارہ کر دیا تھا جو تقسیم کے نتیجہ کے طور پر ملک کو پیش آئے۔ لیکن بدقسمتی کہ ان کی بات نہ مانی گئی۔ اور ملک کو تاریخ کے سب سے ہولناک حادثہ کا شکار ہونا پڑا۔

ملک میں خانہ جنگی ہوتی ہے۔ ختم ہو جاتی ہے حادثات ہوتے ہیں۔ اور کچھ عرصے کے بعد ان کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ ایسا حادثہ تھا۔ جو بظاہر تو ختم ہو گیا۔ لیکن اس کے اثرات کہیں زیادہ ملک میں ہیں۔ دونوں ممالک کے درمیان نفرت کی ایک خلیج حائل ہو چکی ہے۔ ایسے جھگڑے پیدا ہو چکے ہیں۔ جو شاید کبھی نہ مٹ سکیں گے۔ اور خود اندرونی طور پر دونوں ملکوں کے باشندوں کی اکثریت کے ذہن مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہندو اور مسلمانوں کے خوشگوار تعلقات کے درمیان بیزاری کا خلا پیدا ہو گیا ہے یہ اسی تقسیم کا نتیجہ ہے جسے مسلم لیگ مسلمانوں کے لئے رحمت سمجھتی تھی۔ اور کانگرس نے معمولی سی مخالفت سے گھبرا کر اسے منظور کر لیا تھا۔ اور اس طرح ہندوستانی عوام کو ان دونوں جماعتوں نے نفرت اور بیزاری کا راستہ دکھایا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اگر تقسیم نہ ہوتی تو بہت بڑا ہنگامہ ہوتا۔ مولانا اس اعتراض کی گہرائی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے اس کا جواب دیتے ہیں۔

اگر تقسیم نہ ہوتی تب بھی شاید کچھ ہنگامے ہوتے، لیکن اتنے خوفناک نہ ہوتے جتنے کہ ۱۹۴۷ء میں ہوئے لوگ لڑتے جھگڑتے پھر تھک ہار کر بیٹھ رہتے۔ ہنگامے خود ہی ختم کر دیتے۔ اور پھر اسی طرح رہنے لگتے۔

آج جو حالات ہمارے سامنے ہیں ان کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا

کے آخری مجسّمے کا حلقہ بگوشِ عقیدت ہے۔ وہ نہ یہ کہتا ہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے، نہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں خدا سے ہمکلام ہوتا ہوں ـــــ ایک معمولی انسان کی طرح معمولی انسانوں کا بھائی ہے اور معمولی طریقے سے رہتا سہتا ہے ـــــ مگر پھر بھی دنیا اُسے سر پر اُٹھاتی ہے۔ مسلمان اُسے آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ اور ہندو اسے سینے سے لگاتے ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی شہنشاہی قوت جس کے مقبوضات پر آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا۔ اُس کے نمائندے اُس کی کڑک دار آواز سے لرزا ٹھتے ہیں اور اپنی طاقت کے تمام نشتر اُس کی جانِ حزیں پر صرف کر دیتے ہیں۔ اسے پکڑتے ہیں، جیل میں بند کرتے ہیں۔ اُس کی زبان پر قفل لگاتے ہیں، قلم پہ پہرے بٹھاتے ہیں۔ مگر اس کی مقبولیت و ہردلعزیزی کا سیلاب ہے کہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے ـــــ ملک میں بڑے بڑے علماء بھی موجود ہیں اور بڑے بڑے صوفیا بھی، مغربی یونیورسٹیوں کے فاضل بھی گھوم رہے ہیں اور مشرقی درسگاہوں کے دستار بند بھی۔ بیرسٹر بھی ہیں اور وکیل بھی۔ شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی۔ خطیب بھی موجود ہیں اور انشا پرداز بھی مگر سب اُس کے آگے عقیدت کی گردن جھکائے کھڑے ہیں ـــــ درآنحالیکہ وہ خود نہ کسی مغربی یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے نہ کسی مشرقی دارالعلوم کا فارغ التحصیل۔

ابھی وہ عمر کے پچیس سال بھی پورے نہیں کرنے پاتا کہ چالیس کروڑ انسانوں کا جمِ غفیر اسے اپنی بڑی بڑی مجلسوں کی صدارت سونپنے لگتا ہے۔ اور آخر پورے ملک کی سب سے بڑی جماعت کی کلاہ قیادت اس کے سر پر رکھ دی جاتی ہے۔

بارہ تیرہ سال تک وہ ہندوستان کے طول و عرض میں مخلوق کی آنکھوں کا تارا بنا رہتا ہے۔ وہ کسی سے کچھ نہیں مانگتا۔ مگر قوم بیک آواز اُسے امام الہند

غور کیجئے ——— دنیا کی اگلی پچھلی تاریخ میں آپ کو کسی ایسی شخصیت کا نام معلوم ہے جس نے بیس بائیس سال کی عمر میں پہلی بار دنیا کو مخاطب کیا ہو ——— اور دنیا بھی سو پچاس آدمیوں کی دنیا نہیں، ہزار دو ہزار کی دنیا نہیں، لاکھ دو لاکھ کی دنیا بھی نہیں۔ بلکہ کروڑوں انسانوں کی دنیا، وہ دنیا جو پورے کرۂ زمین کے پانچویں حصے کی انسانی بھیڑ کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہو ——— اور مخاطب کرتے ہی لوگ دیوانہ وار اس کی طرف دوڑ پڑے ہوں۔ جنھوں نے اُس کی بات کو سمجھا ہو، وہ سر دھن رہے ہوں اور جنھوں نے نہ سمجھا ہو وہ بھی مبہوت بنے اس کی طرف ٹکٹکی باندھے کھڑے ہوں ——— ؟

پھر غور کیجئے ——— کہ یہ شخص پیر بھی نہیں، قطب وولی ہونے کا مدعی بھی نہیں ہے۔ شاعر ہونے کا دعویدار بھی نہیں، پیغمبری کا آوازہ لگانے والا بھی نہیں ہے ——— بلکہ پیغمبروں کا ایک ادنیٰ پرستار خود کو کہتا ہے۔ اور پیغمبری

ہے ـــــــ مگر کام کی جو راہ اس نے بیس بائیس[1] سال کی عمر میں متعین کی تھی ۔ اس پر بدستور قدم جمائے چلا جا رہا ہے ۔ دنیا کی بڑی سے بڑی شہنشاہیت اُسے چڑ کے پر چڑ کے لگاتی ہے اور اپنوں کا گروہ اسے گالیوں پر گالیاں دیتا ہے ۔ مگر وہ نہ اس کی پروا کرتا ہے نہ اُس کی ـــــــ اپنی راہ چلا جاتا ہے ۔ اس کی صحت بگڑ جاتی ہے ۔ سُرخ دمکتا ہوا چہرہ کمھلا کے رہ جاتا ہے جسمانی آرام و آسائش کے لوازم اُس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں ۔ قید و بند کی سختیاں اور اپنوں اور غیروں کی دراز دستیاں اس کے تر و تازہ جسم کو ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا کر رکھ دیتی ہیں مگر وہ کسی سے اس کی شکایت نہیں کرتا ۔ وہ بوڑھا ہو جاتا ہے ۔ مگر جوانوں کا سا عزم و حوصلہ رکھتا ہے ۔ اسے لوگ گالیاں دیتے ہیں ۔ مگر وہ انھیں دعائیں دیتا ہے ۔ اُس کی کمر جھک گئی ہے ۔ بدن پر جھریاں پڑ گئی ہیں ۔ بال روئی کا گالا ہو گئے ہیں ـــــــ مگر آنکھوں کی چمک اور دل کی جوانی بدستور زندہ ہے ۔ آواز کی کڑک اور حوصلے کی گرج بدستور رہی ہے ۔ اس کی قوم والے اُسے چھوڑ چکے ہیں ۔ مگر اُس نے قوم کو نہیں چھوڑا ہے ۔ اپنے اسے بھول چکے ہیں ۔ مگر غیر اس کا لوہا مانتے ہیں ۔ اپنے اسے ڈھا دینا چاہتے ہیں ۔ مگر وہ اُن کیلئے عمارت بنانا چاہتا ہے وہ اپنے کام میں مصروف ہے ـــــــ خاموشی کے ساتھ استقلال کے ساتھ ، جان پر کھیل کر اور سر سے کفن باندھ کر ۔

[1] سن پیدائش ۱۸۶۹ء ۔ الہلال کی ادارت ۱۹۱۰ء سے شروع ہوتی ہے مسلمانوں کی عام جمعیت کی صدارت ۱۹۱۴ء ۔ جمعیت علمائے ہند کی پہلی صدارت ۱۹۲۱ء کانگریس کی صدارت ۱۹۲۳ء

کا لقب دے دیتی ہے۔ وہ اپنے ہواخواہوں کا گروہ بنانے کی کوئی کوشش نہیں کرتا مگر دنیا دوڑتی ہے اور اس کے ہواخواہوں میں اپنا نام لکھوا دیتی ہے۔

مگر اب یکایک ایک دوسری ہوا چلتی ہے ——— اس شخصیت کی شہرت کا آوازہ اپنے ملک سے نکل کر چاردانگ عالم میں پھیلنا شروع ہو جاتا ہے۔ مشرق و مغرب کے بڑے بڑے دعویداران علم و فضل آتے ہیں۔ اور اس سے بات کرکے جب لوٹتے ہیں تو بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ "ہم نے مشرق و مغرب میں اس سے بڑا فاضل کوئی نہیں دیکھا[1]۔" دور دور اس کے نام کا چرچا ہونے لگتا ہے۔ مگر خود اس کا ملک اب اسے بھولنا شروع کر دیتا ہے۔ اغیار اُسے سر پر بٹھانے لگتے ہیں۔ مگر اپنے اُسے آنکھوں سے گرا دینے پر تُل جاتے ہیں ——— لیکن جس طرح اس نے پہلی عزت افزائی پر کوئی غرور و خود پسندی نہ دکھائی تھی، اسی طرح اب اس کم نگاہی و بے اعتنائی پر بھی کوئی شکوہ نہیں کرتا۔ رفتہ رفتہ "اپنوں" کا ہجوم گروہ در گروہ اس سے کٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ اُسے منہ چڑاتا ہے۔ اسے گالیاں دیتا ہے۔ اس پر پتھر اور جوتے برساتا ہے۔ اور اُس کے قتل کے منصوبے گانٹھتا ہے ——— مگر وہ اب بھی اپنی جگہ پر اٹل ہے۔ وہ ان طعنوں کو سنتا ہے اور انتقام لینے کے بجائے ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ گالیوں کی آوازیں اس کے کانوں میں پڑتی ہیں۔ مگر وہ مسکرا کے چپ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے ان حریفوں کے خلاف نہ زبان سے کچھ کہتا ہے۔ نہ قلم سے کچھ لکھتا

---

[1] دیکھو الشانڈ ایشیا مصنفہ جان گنتھر (امریکہ)

مگراس کے باوجود قطب تارے کی طرح وہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔

غور کیجئے ——— دنیا کی تاریخ میں آپ نے کوئی ایسی شخصیت دیکھی ہے؟
اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔
اگلے اوراق میں اسی شخصیت کی ایک جھلک آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

ابوالکلام آزاد ——— کو بُرا کہنے والے اور گالیاں دینے والے بھی اس کے نام سے ناواقف نہیں ہو سکتے۔ اس کو "شو لوائے" کہنے والے بھی اس کی شخصیت کی طاقت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔
مگر کتنے ہیں جو اس شخصیت کی حقیقت سے واقف ہیں؟ کوہ نور کا نام سب نے سنا ہے ——— مگر کتنے ہیں جو کوہ نور کی اصلی قدر و قیمت جانتے ہیں۔؟
پھر اگر آپ نہ جانیں یا نہ جاننا چاہیں تب بھی نہ کوہ نور کی قیمت گھٹ سکتی ہے نہ ابوالکلام کی ——— البتہ خدا اس قوم، اُس ملت اور اس مخلوق پر رحم کرے جو اپنے ہاتھوں اپنے ہیرے کو پھینک دینا چاہے ——— لَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ۔

اس مختصر سے تعارف کے بعد ابوالکلام کی شخصیت کے چند پہلو آپ کے سامنے پیش ہیں۔

جولائی ستمبر ۱۹۴۵ء میں یہ مضمون "پیغام حق" لاہور میں شائع ہوا تھا۔
مگر اس کی تعداد اتنی نہ تھی کہ مانگنے والوں کی فرمائش پوری کی جا سکتی۔ ابوالکلام کو

وہ نہ طعنوں کا جواب دیتا ہے۔ نہ گالیوں پر کچھ بولتا ہے۔ نہ یہ سوچتا ہے کہ جوانی کے ایام میں مجھے سر پر بٹھانے والے بڑھاپے میں مجھ پر جوتے کیوں پھینک رہے ہیں عوام اسے اپنے سیلاب میں بہالے جانا چاہتے ہیں۔ مگر اُس کے پاؤں اپنی جگہ سے نہیں اکھڑتے۔

آپ جانتے ہیں، یہ شخص کون ہے۔؟

مشہور ہے کہ دنیا میں آدمی جوانی میں ابھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بڑھاپے کے قریب اُبھرتا ہے۔ لیکن مرنے کے بعد چمکتا ہے۔

دنیا کے اکثر بڑے آدمیوں کی رُوح پکار پکار کر کہتی ہے کہ زندگی میں تم نے ہمیں ٹھکرایا۔ مگر مرنے کے بعد ہمیں آسمان پر لا بٹھایا۔

لیکن جس شخصیت کا ذکر ہم کر رہے ہیں۔ اُس کے ساتھ معاملہ برعکس ہے۔ اُسے جوانی میں ——— جوانی میں بھی نہیں، اُٹھتی جوانی میں ——— دنیا نے سر پر بٹھایا۔ اور آنکھوں سے لگایا۔ مگر پھر اس دنیا نے یہ چاہا کہ جیسا ہم چاہتے ہیں ویسا کرو۔ اُس نے اس مطالبے کے ماننے سے انکار کر دیا ——— اس کی قوم نے یہ سنا تو اُسے ذلیل کرنا شروع کیا۔ اور اپنی نظروں میں اُسے ذلیل سمجھ لیا۔ لیکن باہر کی دنیا کی نظر میں وہ ذلیل نہ ہو سکا۔

خلاصہ یہ کہ ——— نوجوانی میں اسے شہرت و سرفرازی کے پھولوں سے لاد دیا گیا ——— مگر بڑھاپے میں پتھروں اور جوتوں سے اس کی تواضع کی گئی۔

بڑا آدمی

بڑے آدمی کو اگر دیکھ لیا جائے، تب تو کوئی بات نہیں۔ لیکن اگر اُسے دیکھا نہ جائے اور صرف اُس کے کارناموں کو دیکھ کر اس کی خیالی تصویر ذہن میں قائم کی جائے تو وہ بہت ہی دلچسپ ہوتی ہے۔ مثلاً آپ ایک ادیب کے مضمون کو پڑھتے ہیں۔ اور اُن مضمونوں کی مدد سے اُس کی ہیئت کذائی کا ایک خیالی نقشہ ذہن میں بنا لیتے ہیں .... وہ بہت موٹا ہوگا۔ اُس کے ایک چھوٹی سی توند بھی ضرور ہوگی۔ آنکھیں تیزی سے چمکتی ہوں گی، باتیں بڑی ذہانت سے کرتا ہوگا۔ .... غرض اسی قسم کا کوئی نقشہ۔

لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسانی ذہن کی تصوری تصویر حقیقت کے مطابق نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے آدمی کو دیکھنے کے بعد عموماً لوگوں کو مایوسی ہوتی ہے۔ اور وہ بے ساختہ کہہ اُٹھتے ہیں۔

"ہیں! یہ ہے وہ جو ....؟"

چنانچہ ایک مرتبہ ایک صاحب نے گاندھی جی کو دیکھا تو انہیں اتنی مایوسی ہوئی کہ انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ بار بار پوچھتے تھے:۔ کیا واقعی گاندھی یہی دُبلا پتلا کھوسٹ تما سا شخص ہے؟ اس کا تو سر بھی ذرا سا ہے۔ اس سر

لوگ کچھ ہی سمجھیں لیکن پھر بھی مشکل سے کوئی دل ایسا ہوگا جو اس سے مرعوب نہ ہو۔ اَلَدُّ الخِصَام قسم کے لوگوں یا جہالت پر فخر کرنے والے حاسدوں کو چھوڑ کر دوست دشمن دونوں اس کی شخصیت کو عام سطح سے بے حد بالاتر مانتے ہیں۔ اس لئے اس مضمون کی مانگ اتنی بڑھی کہ اسے علیحدہ کتابی شکل میں پیش کرنا پڑا۔

ابوسعید بزمی

(ایم۔ اے)

ہوسکتا ہے۔ اس تصور کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کسی پیر صاحب کے ارادت مند مُرید سے اُس کے پیر کی نسبت کچھ پوچھیں۔ تو وہ ضرور کچھ نہ کچھ باتیں ایسی بتائے گا جو جسمانی اعتبار سے تمام انسانوں میں نہیں ہوتیں۔ مثلاً وہ کہے گا "ارے صاحب ان کی کیا بات ہے، وہ نہ سوتے ہیں نہ کھاتے ہیں .... " یا اسی قسم کی کوئی اور بات۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کفار عرب کا سب سے بڑا اعتراض یہی تھا۔ کہ جو شخص ہماری ہی طرح ہو اور بازاروں میں گھومتا پھرتا ہو۔ وہ خدا کا پیغمبر کیسے ہوسکتا ہے۔؟

انسانی عظمت کا معیار کیا ہے۔؟

اصل یہ ہے کہ انسانی عظمت و بلندی کا معیار جسمانی نہیں۔ روحانی ہوتا ہے لیکن چونکہ عام نگاہیں۔ اس روحانی معیار کی بلندی دیکھنے سے قاصر رہتی ہیں۔ اس لئے وہ "بڑے آدمی" کو بھی عجائب گھر کا ایک اعجوبہ بنا کے رکھ دیتی ہیں۔ حالانکہ ظاہری جسم و جثے کے اعتبار سے دنیا کے اکثر بڑے آدمی بہت نحیف وضعیف واقع ہوتے ہیں۔ بہر حال کسی شخص کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لئے اس سے ایک مرتبہ مل لینا یا صرف دور سے دیکھ لینا ہمیشہ مایوس کن ثابت ہوتا ہے۔ البتہ اگر آپ کی رُوح میں اتنی صلاحیت ہے۔ کہ دوسرے کی روح سے ہم کلام ہوسکے تو پھر عجیب وغریب مناظر نظر آتے ہیں۔ اور یہی وہ معیار ہے جس سے انسان کی انسانیت کو ناپا جاسکتا ہے۔ ورنہ ویسے تو ہر آدمی، گوشت و پوست کا ایک مجسمہ ہے۔ اور اپنی ہر انسانی احتیاج میں دیگر بنی نوع کے مانند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کفار عرب میں سے جن

سے کیسے سوچتا ہوگا"؟

جب ان کا تعجب بہت بڑھا تو ان کے ایک دوست نے کہا "بھئی! بات یہ ہے کہ گاندھی کے پاس بجلی کی ایک بیٹری ہے جسے یہ اپنے سر میں لگا لیتا ہے، اور پھر دور کی بات سوچ سکتا ہے۔

اس تاویل پر انھیں فوراً یقین آ گیا۔ اور اب گاندھی کی عظمت و شہرت کے سوال پر غور کرنے کی بجائے وہ یہ سوچنے لگے کہ کسی طرح بجلی کی یہ بیٹری حاصل کی جائے۔

انسانی دماغ کی عجائب پرستی:۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی دماغ چونکہ ہر چیز کا اندازہ کرنے کے لئے مادے کا سہارا ڈھونڈھتا ہے۔ اس لئے انسانی شہرت و عظمت کے لئے بھی وہ کوئی مادی مظہر چاہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جو آدمی جتنا مشہور ہو اسے اتنا ہی لحیم و شحیم اور قوی ہیکل ہونا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ اصنام پرست اقوام نے دیوی دیوتاؤں کی شکلیں بناتے وقت اپنی عقیدت و احترام کے تصور کو کسی مادی شکل میں ظاہر کیا ہے۔ مثلاً ہندوؤں کے یہاں کسی دیوی کے ہاتھ چار ہیں۔ کسی کے پاؤں آٹھ ہیں۔ کسی کے سر پر سینگ ہیں تو کسی کی ناک کے آگے ایک لمبی سی سونڈ لٹک رہی ہے۔ حد یہ ہے کہ انسانی دماغ نے پیروں اور پیغمبروں کو بھی جسمانی اعتبار سے ایک عجیب الخلقت چیز بنا کے رکھ دیا ہے۔ وہ بیچارے سمجھتے ہیں کہ جس آدمی کے ہاتھ، ناک، کان ہماری ہی طرح ہیں جو ہماری ہی طرح ضروریات زندگی کا محتاج ہے۔ وہ "بڑا آدمی" کیسے

پہلا تعارف

اس مختصر سی تمہید کے بعد اب آیئے ہندوستان کی ایک ایسی شخصیت پر تنقیدی نگاہ ڈالیں جو آج بیک وقت قوم کی محبوب بھی ہے اور قوم کی "مغضوب" بھی۔ ہماری مراد مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات سے ہے جن کے کلام کی بلاغت اور خطابت کی ساحری نے ہر اس انسان کا دل موہ رکھا ہے۔ جو ان کی تحریر اور تقریر سے واقف ہے۔ لیکن اس کے باوجود کانگریس کی صدر کی حیثیت سے طعن و تشنیع اور طنز و استہزا کے جتنے تیر ان کی طرف چلائے جاتے ہیں۔ وہ دنیا کے بہت کم "بڑے آدمیوں" کی قسمت میں آئے ہوں گے۔

سب سے پہلے میں نے مولانا کا نام اس وقت سنا جب میری عمر ان کے کلام کو سمجھنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی تھی۔ تاہم الہلال اور البلاغ کے مضامین کا جو چرچا گھر میں ہوتا رہتا تھا۔ اس نے غیر شعوری طور پر مولانا کی عظمت و برتری کا ایک گہرا نقش میرے نیم پختہ دماغ میں پیوست کر دیا۔ میرے والد مولانا کے مضامین بہت جھوم جھوم کے پڑھتے تھے۔ اور جس طرح مجلس مشاعرہ میں سخن فہم لوگ کسی شعر پر بے ساختہ داد دیا کرتے ہیں۔ اسی طرح

لوگوں کی روحوں پر تاریکی و ضلالت کے غلاف چڑھے ہوئے تھے۔ وہ نور نبوت سے آمنے سامنے ہونے کے باوجود ایمان و یقین کی روشنی سے بہرہ مند نہ ہو سکے۔ اور آخر تک "لَا یُؤْمِنُوْنَ" کی صف میں شامل رہے۔

ایک جلسے میں میں نے لیڈروں کے بھرے مجمع کو دُور سے دیکھا تو اگرچہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے بھاری بھر کم جسم و جثے نے مجھے کافی متاثر کیا۔ مگر مولانا ابوالکلام کے انداز گفتگو اور طریق نشست و برخاست میں جو بات تھی۔اس نے میری نگاہوں کے سامنے ایک روحانی نقشہ کھینچ دیا۔ میں نے مولانا کی تقریر نہیں سُنی۔ مگر اُن کی وضع قطع اور اُن کی بات چیت میں ایسی دلکشی تھی کہ میں انہیں ایسے دیکھنے لگا۔ جیسے ایک افسانہ پسند نوجوان پردۂ فلم پر کسی ہیرو قسم کے ایکٹر کو دیکھتا ہے۔

خلافت اور ترک موالات کی تحریک بہت ہنگامہ آفریں تحریک تھی۔ خصوصاً نوجوانوں کے لئے تو اس میں وہ سرور و کیف تھا کہ کیا کہیے۔ مگر افسوس کہ اس تحریک کی زندگی بہت ہی مختصر ثابت ہوئی۔ اور دو تین سال کے عرصے میں اُس نے بچپن سے لے کر شباب و شیب کے تمام مراحل طے کر کے موت کی آغوش میں پناہ لے لی۔ اس کے بعد ملک میں وہ طوفان اٹھا جس میں شردھانند جی نے مسلمانوں میں ایک لازوال رسوائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ہر طرف سے شدھی اور سنگھٹن کے جواب میں تبلیغ و تنظیم کی آوازیں کانوں میں گونجنے لگیں۔ اور سیاست کے اسٹیج پر نئے نئے ایکٹر آنے شروع ہوئے۔ پُرانی بساط قیادت الٹی گئی اور نئے نئے مہروں نے اُن کی جگہ لے لی ——— اور یہیں سے مولانا ابوالکلام کی ہردلعزیزی میں گھن آنا شروع ہوا۔

غصہ اور نفرت

مولانا نے اس تحریک میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ دوسروں کی طرح مجھے بھی ان

وہ بھی مولانا کے مختلف جملوں اور فقروں پر مست ہو کر داد دیا کرتے تھے۔ حالانکہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ اُن کی اس داد کو سننے والا میرے چھوٹے سے متحیر دماغ کے سوا اور کوئی نہ ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں انھوں نے مولانا کو کئی خطوط بھی لکھے۔ اور جب ان کا جواب آتا تھا تو اسے اس قدر ذوق و شوق کے ساتھ پڑھتے تھے۔ کہ کیا کوئی عاشق دلفگار، نامۂ محبوب کو پڑھتا ہو گا۔ مگر میرے لئے ان خطوں میں اس کے سوا اور کوئی دلچسپی نہ ہوتی تھی کہ ان کے حسین و خوشنما سرنامے کو دیکھ لوں، اور کاغذ کی نفاست کی داد دے لوں۔

نوعمری کا پہلا تاثر۔

مگر میری سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ آخر مولانا کی وہ کونسی ادا ہے جس پر میرے گھر کے سارے بزرگ وارفتہ ہیں اور جس نے ان کی ذات کو ہم سب کا محبوب بنا دیا ہے۔

یہ جنگ بلقان و طرابلس کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد پچھلی جنگ عظیم چھڑ گئی۔ اور مولانا کی آواز بہت دنوں تک سنائی نہ دی۔ پھر خلافت کی تحریک کے نام سے ملک میں وہ بھونچال آیا جس سے ہم سب واقف ہیں۔ اس زمانے میں میرا شعور ایک حد تک سیاسی ہنگامہ آرائیوں کے سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۹ء میں کانگریس کے صدر کی حیثیت سے مولانا نے جو خطبۂ صدارت دیا تھا وہ میرے لئے بھی بے حد ولولہ آفریں ثابت ہوا۔ مگر اس زمانے میں مولانا محمد علی اور شوکت علی کی شخصیتیں اتنی بلند ہو گئی تھیں۔ کہ بظاہر مولانا ابو الکلام کا چراغ اُن کے آگے کچھ ماند سا نظر آتا تھا۔ مگر جب سب سے پہلی بار خلافت کے

مگر اس پوری مدت میں وہ کانگریس سے ایک منٹ کے لئے بھی جدا نہ ہوئے

تاہم ابھی تک مسلمانوں میں کانگریس کا نام خاص اشتعال پیدا کرنے کا موجب نہ ہوتا تھا۔ کانگریس کو "ہندوؤں کی جماعت" کہنے والے مسلمانوں کی تعداد اگرچہ کافی ہوتی جا رہی تھی لیکن پھر بھی اس کی سیاست اور اس کی قربانیوں کا اعتراف ہر شخص کے دل میں تھا۔

آزادی کی اہمیت کا پہلا احساس

اس کے بعد ۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۳۴ء تک کی وہ سول نافرمانی شروع ہوئی جس نے اگرچہ مسلمانوں میں کوئی ہیجان پیدا نہیں کیا لیکن ہندوستان کی فضا میں خاصی چہل پہل نظر آنے لگی۔ ایک نوجوان کے لئے اس ہنگامے میں بھی بڑی دلچسپی تھی۔ لیکن اب مسلمانوں کی طرف سے عام طور سے جو رویہ اختیار کیا جانے لگا تھا۔ وہ دس سال پہلے کی ترک موالات کے مقابلے میں کم از کم میرے لئے بہت ہی حیرتناک تھا۔ شدھی اور سنگھٹن کے بعد شاردا بل اور نہرو رپورٹ کی ہنگامہ آفرینیوں نے کانگریس کے خلاف میرے دل میں بھی ایک بیزاری سی پیدا کر دی تھی۔ اور اس بیزاری کے سیلاب میں مولانا ابوالکلام کی شخصیت بھی خس و خاشاک بن کر بہہ چکی تھی۔ مگر کانگریس کی سول نافرمانی کے زمانے میں جب پولیس کے سپاہیوں کی لاٹھیاں نہتے عوام پر پڑتی تھیں۔ تو اُن کی ہر ضرب سے یہ صدا نکلتی تھی کہ "ہندوستان میں ہندو مسلمان کے سوال سے کہیں زیادہ وہ اہم سوال، ہندوستان اور انگریز کا سوال ہے۔ اس لئے اپنے دوسرے ہمنوا دوستوں کی طرح میں بھی اس جدوجہد میں ہندوؤں کی تحقیر و تضحیک کو پسند نہیں کر سکتا تھا۔

کی یہ ادا بہت ناپسند آئی۔ خلافت و ترک موالات کی تحریک کے بعد مجھ جیسے نوجوانوں کی ہنگامہ پسندی کے ذوق کو تسکین دینے کے لئے شدھی اور تبلیغ کے جلسوں اور جلوسوں سے بہتر اور کوئی میدان نہ ہو سکتا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ مولانا ابوالکلام اس تحریک کی قیادت کریں۔ مگر میرے ایک دوست کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ:۔

"قوموں کی تعمیر میں جوش و خروش سے زیادہ ضبط و نظم کی ضرورت ہے۔"

مولانا کے اس جملے نے میرے جذبات غضب کی دہکتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ جس شدت سے میں اُن کا معتقد تھا، اُسی شدت سے اب میں اُن کا نکتہ چیں ثابت ہونے لگا۔

شدھی اور سنگھٹن کی آندھیاں دھواں دھار انداز سے ملک میں چلتی رہیں جس سے ہندوستان کے طول و عرض میں ایک زلزلہ سا آ گیا۔ مگر مولانا اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ آخر وہ وقت آیا کہ شردھانند جی کی زندگی کے چراغ کو ایک پُرجوش نوجوان نے آگے بڑھ کر بجھا دیا جس کے ساتھ یہ تحریک بھی تیزی کے ساتھ ٹھنڈی پڑ گئی۔ مگر اس کے فوراً ہی بعد ستیارتھ پرکاش اور رنگیلا رسول اور نہرو رپورٹ کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اور جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ مولانا ابوالکلام اس میں بھی ہمارے شریک نہیں ہیں۔ تو اشتعال کا طوفان جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ مگر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہندوستان میں مولانا ہیں ہی نہیں۔ خطوں کے جواب بھی اب وہ بہت ہی کم دیتے تھے۔ اور تحریر و تقریر کا میدان تو انھوں نے برسوں سے چھوڑ رکھا تھا۔

بوڑھی شہنشاہیت کا اثر نوجوان دماغ پر

۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۳۰ء کا زمانہ ہندوستان کی ہندو مسلم سیاست کے لحاظ سے بڑا پر آشوب زمانہ رہا ہے۔ لیکن ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۷ء تک نسبتاً بہت پُرسکون زمانہ تھا۔ اگرچہ گائے اور پیپل کے جھگڑوں سے یہ زمانہ بھی خالی نہ تھا۔ مگر ہندو مسلم کشیدگی کی کوئی منظم تحریک اس زمانے میں نہ تھی۔ اس کے برعکس مصالحت و مفاہمت کی فضا پیدا کرنے کے جذبات آہستہ آہستہ پرورش پا رہے تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء میں جب "آئین جدید" کے تحت صوبائی انتخابات ہوئے تو کانگریس کے حلقوں میں مسلم لیگ کے امیدواروں کو خوش آمدید کہنے کی فضا تھی۔ بلکہ بعض مقامات پر تو جواہر لال نے کھلے طور پر یہ مشورہ دیا کہ وہ مسلم لیگ کے امیدواروں کو ترجیح دیں۔

اصل یہ ہے کہ ۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۳۷ء تک کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب برطانوی شہنشاہیت ننگی ہو کر ہندوستان کے سامنے آگئی تھی۔ اور کانگریس کی تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے تمام وہ حربے استعمال کئے جا رہے تھے۔ جو ایک بدیسی حکومت اپنے مقبوضات کو بزور شمشیر اپنے قبضے میں رکھنے کے لئے استعمال کیا کرتی ہے۔ اس لئے ہندوستان کے اُن چند خوش حال و خوشباش

اس تحریک کے دوران میں میں نے ایک ذمے دار انگریز عہدیدار کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ ہندوستانی بڑے ذلیل ہوتے ہیں۔

میں نے کہا۔ کیا آپ اس میں مسلمانوں کو بھی شامل کرتے ہیں۔؟

اس پر وہ ہنس پڑا، مگر اس کی ہنسی میں نفرت و حقارت کی ایسی تلخی تھی کہ میں اُسے کبھی نہیں بھول سکتا۔" بولا "تم بُرا نہ مانو، ہم مسلمانوں کی وفاداری کا کافی خیال رکھتے ہیں۔"

ان الفاظ میں ہندوستان کی قومی خودداری کے لئے جو زہریلے نشتر چھپے ہوئے تھے انھیں بمشکل بھلایا جا سکتا تھا۔

پہلی ملاقات

مولانا سے میری پہلی ملاقات ۳۸ء میں کلکتہ میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عیدین کی امامت کے سلسلے میں ان کے خلاف زبردست ہنگامہ ہو رہا تھا۔ اور جس کے نتیجے میں آخر کار انھیں اس منصب سے اپنی دستبرداری کا اعلان کرنا پڑا۔ مولانا کے اس اعلان کے چند روز بعد ہی میں ان سے ملا اور چونکہ بہت سے مسائل پر آزادی کے ساتھ تفصیلی گفتگو کرنا مقصود تھا۔ اس لئے ملاقاتوں کا یہ سلسلہ کئی روز تک جاری رہا اور مجموعی طور پر کم و بیش بیس بائیس گھنٹے ان سے دوبدو باتیں ہوئیں۔ مولانا سے میری یہ باتیں کسی اخباری نمائندے کے انٹرویو کی حیثیت نہ رکھتی تھیں۔ بلکہ احقاق حق کے خیال سے اپنے دل کو مطمئن کرنے کی یہ ایک ایسی کوشش تھی جو ایک عقیدت مند مگر نکتہ چین و غیر مطمئن قسم کا شاگرد اپنے استاد کے رُوبرو بیٹھ کر کرتا ہے۔ اسی لئے میری اس گفتگو کے موقعہ پر میرے اور مولانا کے سوا کمرے میں کوئی تیسرا آدمی نہ ہوتا تھا اور مولانا بھی میری "سعادت مندی" پر کامل بھروسہ رکھتے ہوئے بڑی آزادی کے ساتھ ہر مسئلے پر اپنی رائے ظاہر فرماتے تھے۔ "سعادت مندی" کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا کہ اس ملاقات کے بعد میں نے یہ چاہا کہ بعض باتیں پریس کو دے دوں۔ چنانچہ میں نے ان کو قلمبند کر کے مولانا کے

کسی موضوع پر خاموشی کی یہ مہر ٹوٹتی تھی تو ساحرانہ خطابت کا ایک بے پناہ سیلاب اُمڈ پڑتا تھا۔ مگر میں یہ محسوس کرتا تھا کہ کانگریس کے ہندو حاضرین کے دل و دماغ کے لئے مولانا کی اس خطیبانہ جادوگری کی حیثیت بھینس کے آگے بین بجانے سے زیادہ نہ تھی۔ مولانا بول رہے ہیں اور پھول کیا رہے ہیں۔ موتی بکھیر رہے ہیں۔ مگر ہندو سامعین ہیں کہ جمائیاں لے رہے ہیں۔ اور احمقوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھ رہے ہیں۔ میں محسوس کرتا تھا کہ کانگریس کے ایوان میں مشکل سے دو چار نفوس ایسے ہوتے ہوں گے جو مولانا کی شخصیت کے اس پہلو کی صحیح قدر و قیمت سے واقف ہوں۔ پھر سب سے زیادہ المناک منظر یہ ہے کہ جو لوگ کانگریس کے سب سے بڑے لیڈر ہیں۔ اور جو جلسوں کے موقعہ پر ڈائس کی زینت بنائے جاتے ہیں۔ وہی مولانا کی خطیبانہ ساحری سے سب سے زیادہ ناواقف ہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جو مولانا کی زبان پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اور اسے مشکل و ادق زبان قرار دے کر اپنی بدمذاقی کا بدترین ثبوت مہیا کرتے ہیں ـــــــ لیکن اس کے باوجود مولانا انہی کے سب سے زیادہ دوست ہیں۔

پھر کیا مولانا بیوقوف ہیں؟ یا ہندوؤں سے مرعوب ہیں؟ یا مولانا محمد علی مرحوم کے قول کے مطابق محض "ضدی" ہونے کی وجہ سے اپنی بات پہ اڑے ہوئے ہیں؟ یا بعض انتہا پسند و مشتعل مزاج مسلمان دوستوں کی رائے کے بموجب کانگریس کے تنخواہ دار ہیں اور محض پیسے کے لالچ میں کانگریس کو نہیں چھوڑتے ـــــــ؟

موجودہ حالات کو دیکھ کر اس قسم کے بہت سے سوالات دماغوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ آئندہ سطور میں ہم انہی کا جواب معلوم کرنیکی کوشش کریں گے۔

کی ہر ادا میں تکلّف و تصنّع ہو مگر یہ تکلف و تصنع طبیعت میں اتنا رچا ہوا ہو کہ بالکل قدرتی اور بالکل برجستہ و بے ساختہ معلوم ہو۔ مولانا کے ملازم کی گفتگو میں یہ چیز پورے کمال کے ساتھ تو نہ تھی۔ مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے۔ کہ ہندوستان کے طبقۂ امرار کے عام ملازموں کے مقابلے میں اُس کا لب و لہجہ اُس تہذیب و تمدن کی طرف اشارہ کرتا تھا جو ہندوستان میں مسلمانوں کے ہزار سالہ عہدِ حکومت نے پیدا کی ہے اور جو آج اکھنڈ ہندوستان و پاکستان کی کشمکشوں کے نتیجے میں بُری طرح پامال ہوتی جا رہی ہے۔

عنقا اپنے آشیانے میں

میرے آنے کی اطلاع پانے کے فوراً بعد ہی مولانا نے مجھے بلا لیا۔ مولانا کا کمرہ دوسری منزل پر واقع تھا۔ جب میں اس تک پہنچنے کے لئے زینے پر چڑھا تو میں نے دونوں طرف کی دیواروں کو خاص طور سے دیکھا۔ لیکن پان کی پیک، سیاہی کے دھبے، سگریٹ کے ٹکڑے یا ہاتھ کی رگڑ کے کوئی ایسے نشانات مجھے نہ ملے جو ہمارے "مشرقی طرز کے سادہ مزاج" رئیسوں کی کوٹھیوں کی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں۔ سیڑھیوں پر قالین نہیں تھا۔ مگر بہت خوبصورت قسم کا ٹاٹ اس خوش سلیقگی کے ساتھ بچھایا گیا تھا۔ کہ دور سے قالین کا گمان ہوتا تھا۔

میں مولانا کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ چاروں طرف کتابوں اور فائلوں کے ڈھیر میں وہ اس طرح ڈوبے ہوئے بیٹھے ہیں کہ ان کا صرف بالائی حصہ نظر آسکتا تھا۔ لباس ان کا بہت سادہ تھا۔ شیروانی میں دو جگہ رفوگری سے کام لیا گیا تھا۔

سامنے اجازت حاصل کرنے کی غرض سے پیش کیا۔ مگر جب مولانا نے یہ فرمایا کہ اس میں بہت سے اشارات ایسے ہیں کہ اگر ان کی پوری توضیح نہ کی جائے تو غلط فہمیاں پھیلنے کا امکان ہے تو میں نے اس کی اشاعت کا خیال ترک کر دیا۔

مگر اب اس کو کافی عرصہ گذر چکا ہے اور وقت کے وہ نازک مسائل جو اس وقت کی سیاسیات پر اثر انداز ہو سکتے تھے۔ اب باقی نہیں رہے ہیں۔ اس لئے ایک نامہ نگار یا رپورٹر کی حیثیت سے محض اظہار واقعہ کے طور پر نہیں، بلکہ ہندوستان کے ایک عظیم الشان شخصیت کو صحیح روشنی میں دیکھنے کی غرض سے ذیل میں اپنے کچھ تاثرات پیش کرتا ہوں۔

بالی گنج میں ڈرائیور نے ایک خوبصورت قسم کے بنگلے کے سامنے کار روک کر کہا "یہی ہے مولانا آزاد کی کوٹھی"!

لیکن ہندوستان کے مولویوں اور مولاناؤں کا جو تصور ہم سب کے ذہن میں ہے۔ اس کی بنا پر سمجھا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے مکان تلاش کرنے میں غلطی کی ہے۔ روشیں صاف ستھری۔ گملوں کے پودے آراستہ و پیراستہ، پیڑوں کی صفیں باسلیقہ گیلری کا فرش شستہ و رُفتہ، غرض ہر چیز کا قرینہ و سلیقہ یہ بتا رہا تھا کہ اس قیامگاہ کو کسی "مولانا" کی قیام گاہ نہ ہونا چاہیئے۔ تاہم میں نے آگے بڑھ کر چوکیدار کو آواز دی۔ میری آواز پر چھریرے جسم کا ایک نوجوان برابر کے کمرے سے باہر نکلا۔ اس کی وضع قطع ادنیٰ ملازموں ہی کی سی تھی۔ مگر اس کا لب و لہجہ اتنا مہذب و شستہ تھا کہ دہلی اور اودھ کی اس پاکیزہ تہذیب کے آثار مجھے نظر آنے لگے۔ جس کے نقوش اب روز بروز دھندلے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ تہذیب کا کمال یہ ہوتا ہے۔ کہ آدمی

تیں شروع ہوتی ہیں

مولانا کی گفتگو کا آغاز ذاتی یعنی غیر سیاسی قسم کی باتوں سے ہوا۔ مگر اس کے
وجود اس میں فرسودگی نہ تھی۔ جو "کہیئے فلاں صاحب کا کیا حال ہے۔ اور کہیئے
لاں دوست کیسے ہیں۔" کی قسم کے استفساروں میں ہوا کرتی ہے۔ میں نے مولانا
کے پہلے ہی جملے سے یہ اندازہ کیا کہ قدرت نے انھیں سب سے بڑی خصوصیت یہ
عطا کی ہے۔ کہ وہ بہت ہی فرسودہ و پامال قسم کی باتوں کو بھی ایسے الفاظ میں پیش
لنے کا ہُنر جانتے ہیں کہ ان میں ندرت و جدت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ
دوسری خاص چیز یہ ہے کہ ان کا لب و لہجہ اور گفتگو کا انداز اتنا شگفتہ ہوتا ہے۔
کہ سننے والا نہ تو انہیں ناصح مشفق یا واعظِ خشک سمجھ سکتا ہے اور نہ ان کی عظمت
و برتری کے احساس کو بالائے طاق رکھ سکتا ہے۔ وہ ان کی ملاقات میں ایک دلچسپی
شگفتگی محسوس کرتا ہے اور ایک لمحے کے لئے بھی اس کے جی میں کوئی ایسی اُکتاہٹ
پیدا نہیں ہوتی جو عموماً "بڑے لوگوں" کی مجلس میں ہو جایا کرتی ہے۔ مولانا کے
سامنے آپ ادب و احترام کی تمام بندشوں کے باوجود اپنے آپ کو بالکل کھلا ہوا
سا محسوس کریں گے۔ آپ اپنی روح میں کوئی گھٹن یا اپنی حرکات و سکنات میں کوئی
ناقابلِ برداشت بندھن محسوس نہیں کریں گے۔ پھر ایک اور خاص چیز یہ ہے کہ باتیں
زیادہ تر مولانا ہی کریں گے اور مسلسل کریں گے۔ مگر اندازِ گفتگو میں نہ تو تقریر کا سادہ
خشک انداز ہوگا۔ جو آپ کو تھکا دے۔ اور نہ وعظ و پند کی وہ شان ہوگی جس سے
آپ خود کو حقیر محسوس کرنے لگیں۔ اس کے برعکس آپ مولانا کے احترام کے باوجود
ان سے ایک قسم کی بے تکلفی محسوس کریں گے۔ اور عظمت و بزرگی کے تمام آداب

مگر پہننے کا سلیقہ ایسا تھا کہ بے ڈھنگے پن کا اعتراض نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دونوں طرف کتابوں کے شیلف تھے۔ میز پر بھی ریک میں کتابیں رکھی تھیں۔ ایک طرف انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا تازہ ترین ایڈیشن سلیقے کے ساتھ لکڑی کے خوبصورت ریک میں رکھا تھا۔ پیچھے شیشے کی الماریوں میں عربی کی کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ جن کی چرمی جلدوں پر سنہری حروف میں ہر ایک کا نام کندہ تھا۔ یہ کمرہ کچھ زیادہ وسیع نہ تھا۔ مگر اس کے باوجود اس میں علم و فضل کا مظاہرہ کچھ اس شان کے ساتھ تھا کہ عالمِ خیال میں رازی و غزالی کے کتب خانوں کا نقشہ میرے سامنے آ گیا۔ کمرے میں پرانی کتابوں کے اوراق کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ جو شائقین علم کے لئے ایک بوئے جانفزا کا حکم رکھتی ہے۔ میز پر جو کاغذ اور کتابیں پڑی ہوئی تھیں۔ اُن میں بدسلیقگی تو نہ تھی۔ مگر وہ سلیقہ بھی نہ تھا جو کلکٹر یا کمشنر کی میز پر آپ کو نظر آ سکتا ہے۔ ایک طرف کوئی کتاب کھلی رکھی ہے تو دوسری طرف کاغذات کی فائلیں پڑی ہیں۔ کہیں مجلد بیاض رکھی ہے تو کسی طرف کچھ مسوّدات ہیں۔ پیپر ویٹ کا نصف حصہ کسی کتاب کے نیچے دبا ہوا ہے۔ قلمدان کا کونہ کاغذ سے چھپا ہوا ہے ———— لیکن اس کے باوجود گرد و غبار یا میل کچیل کا کوئی وجود نہ تھا۔ مولانا نے تبسّم کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا۔ اور مصافحے کے فوراً ہی بعد ایسی بے ساختگی کے ساتھ باتیں شروع کر دیں۔ کہ پہلی ملاقات کی وجہ سے مجھ پر جو اعصابی انتشار طاری تھا وہ سب چند منٹ میں غائب ہو گیا۔ اور میں ایسا محسوس کرنے لگا۔ گویا مجھے مولانا کی خدمت میں بہت پرانی نیاز مندی حاصل ہے۔

وہ خود ہی میری طرف سے بھی بولتے تھے اور اپنی طرف سے بھی۔ وہ بیک وقت وکیل بھی تھے اور موکل بھی، مستغیث بھی تھے اور منصف بھی۔ سائل بھی اور مجیب بھی، مفتی بھی اور مستفتی بھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ان دونوں حیثیتوں کو وہ اپنے الفاظ میں اس خوبی سے پیش کرتے تھے کہ مجھے ایک لمحہ کے لئے کبھی یہ خیال پیدا نہ ہوسکا کہ مولانا میری تو سنتے ہی نہیں، اپنی ہی کہے چلے جاتے ہیں۔ وہ بلاشبہ مجھے بولنے کا موقعہ بہت کم دیتے تھے۔ لیکن چونکہ وہ خود اپنی زبان سے میرے اعتراض کو بڑی شرح و لسط کے ساتھ کافی زوردار الفاظ میں بیان کر دیتے تھے۔ اس لئے میرے دل میں یہ الجھن پیدا نہیں ہوتی تھی۔ کہ میری بات تو مولانا نے سُنی ہی نہیں۔

لیکن مولانا کی اس طویل گفتگو کے باوجود ان کے لب و لہجے کا یہ اعجاز ناقابل تقلید تھا کہ ان کے انداز بیان میں نہ تو مقرر و اعظ کی سی شان پیدا ہوتی تھی اور نہ استاد و ناصح کی سی۔ اس کے برعکس گفتگو کا وہ انداز پوری شان سے باقی رہتا تھا جس میں آدمی ہر ہر جملے پر خود کو مخاطب الیہ سمجھتا ہے۔ اور بے تکلفی کی وہ کیفیت محسوس کرتا ہے۔ جسے انگریزی میں ہارٹ ٹو ہارٹ ٹاک (HEART TO HEART TALK) کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کے الفاظ اتنے جچے تلے اور ایسے بلیغ و خطیبانہ ہوتے تھے۔ کہ اگر انھیں قلمبند کر لیا جائے تو ادب کا ایک بہترین نمونہ ثابت ہوں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے طرز ادا میں باہمی گفتگو ہی کی سی شگفتگی اور بے ساختگی ہوتی تھی۔ وہ کبھی مسکراتے تھے اور کبھی مجھ سے ہاں یا نہیں کہلواتے تھے۔ کبھی کوئی چٹکلہ

کے باوصف، ان سے ایک گونہ مساوی سطح پر باتیں کرنے کا لطف اٹھائیں گے۔

میری یہ پہلی ملاقات بہت مختصر تھی۔ اور اگرچہ اس میں کسی سیاسی مسئلے پر کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ تاہم مولانا نے جو کچھ کہا اس وقت کے بہت سے اہم مسائل پہ ایک سرسری سا تبصرہ ہو گیا۔ اس دوران میں عشاء کی نماز کا وقت آگیا اور مولانا نے تفصیلی ارشادات کے لئے دوسرے دن صبح کا وقت مقرر کر کے فریضہ نماز کی تیاری شروع کر دی۔

بیک وقت سائل بھی اور مجیب بھی

اس کے بعد مسلسل کئی روز تک میں ایک ایسے تلمیذ بے تمیز کی حیثیت سے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا جو شکوہ و شکایت سے لبریز تھا۔ میں نے بیسیوں اعتراضات بڑی بے باکی سے کئے مگر مولانا کی یہ ادا دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ وہ دو چار لفظ سن کر ہی میرے اعتراض کی پوری حیثیت کو بھانپ لیتے تھے۔ اور پھر میرے پورے اعتراض کو خود اپنے الفاظ میں اس خوبی سے پیش کر دیتے تھے کہ میں بھی اس خوبی سے پیش کرنے پر قادر نہ ہو سکتا تھا۔ اپنے اعتراض کو ان کی زبان سے اس طرح سننے کے بعد میں سمجھتا تھا کہ اب اس کا کوئی جواب ان کے پاس نہ ہوگا۔ مگر جب وہ جواب دینا شروع کرتے تھے تو اعتراض کا سارا دھندلکا اس طرح غائب ہونے لگتا تھا جیسے سورج نکلنے کے بعد کہر کا غبار غائب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

مولانا سے میری چھ سات روز کی گفتگو اوسطاً ۳ گھنٹے رہی ہوگی۔ مگر اس دوران میں خود مجھے بولنے کی ضرورت گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سے بھی کم ہوئی۔

ظریفانہ فقرے اور خندہ آور چٹکلے چھوڑنے میں ایسے ماہر ہیں کہ بڑی سے بڑی گفتگو میں بھی آدمی اکتاتا نہیں بلکہ ہر وقت ایک تازگی سی محسوس کرتا رہتا ہے۔ مزید براں وہ سننے والے کے چہرے سے اس کی دلی کیفیت کو بڑی تیزی سے تاڑ لیتے ہیں اور اسی کے بموجب اپنی گفتگو کا رنگ بدل دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ ایک بہترین خطیب وانشا پردازہی نہیں ہیں بلکہ یکتائے روزگار "گفتگو طراز" .... (CONVERSATIONALIST) بھی ہیں۔ کم ازکم میں نے ہندوستان کے "بڑے" آدمیوں کی صف میں ان سے اچھا گفتگو کرنے والا نہیں دیکھا۔

کیا سمجھتے تھے اور کیا نکلا۔

میں نے مولانا سے مختلف صحبتوں میں جو گفتگو کی ان میں میری طرف سے انہی اعتراضات کو پھیر پھیر کر بیان کیا گیا جو عام طور سے ہم سب کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں ——— یعنی کیا ہندو اور مسلمان دو قومیں نہیں؟ کیا مسلمان اپنی کوئی جداگانہ تہذیب و مدنیت نہیں رکھتے؟ کیا کانگریس میں شامل ہونے سے ہندو اکثریت ہماری تمام امتیازی خصوصیات کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کرے گی۔؟ کیا پورے ہندوستان کے جمہوری طرز حکومت میں دس کروڑ مسلمانوں کی تعداد اقلیت بن کر ہندوؤں کے رحم وکرم پر نہ رہ جائے گی۔؟ کیا ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں کو نظر انداز کرنے کی کوششیں زندگی کے ہر شعبے میں نہیں ہو رہیں؟ کیا ان حالات کی موجودگی میں ہندوؤں کے ساتھ تعاون واشتراک ممکن ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

میرا خیال تھا کہ ان سوالات کے جواب میں مولانا کی طرف سے بڑے پُر جوش لفظوں میں کانگریس کے ہر فعل کی حمایت ہوگی اور ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں

چھوڑتے تھے۔اور کبھی کوئی اور ایسی ہی بات کر کے گویا یہ ثابت کرتے رہتے تھے۔ کہ ان کا ذہن مخاطب کے تصور سے خالی نہیں ہے اور مخاطب بھی یہ سمجھتا تھا کہ وہ کسی خطیب یا مقرر کے سامنے نہیں بیٹھا ہے بلکہ ایک معقول و سنجیدہ آدمی سے دوبدو مصروف گفتگو ہے۔

گفتگو کا کمال کیا ہے؟

میں نے ان باتوں کو تفصیل کے ساتھ اس لئے پیش کیا کہ مجھے ہندوستان کے بہت سے "بڑے" آدمیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ مگر اُن میں سے کسی ایک میں بھی میں نے یہ چیزیں نہیں پائیں۔ عام طور سے "بڑے" آدمیوں کی گفتگو میں یا تو خطیب و مقرر کا سا رنگ ہوتا ہے یا ناصح اور واعظ کا سا۔ وہ اپنے مخاطب کا اعتراض سننے یا اس کی بات پر کان دھرنے کی زحمت مشکل ہی گوارا کرتے ہیں اور اگر کوئی مخاطب ایسی جرأت کرے تو اس کی حوصلہ شکنی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ "بڑے آدمیوں کی یہ ادا بہت عام ہے۔ کہ وہ دوسروں کی نہیں سنتے۔ اپنی ہی کہے چلے جاتے ہیں۔ مگر مولانا ابوالکلام کی خصوصیت ..... اس سلسلے میں یہ ہے کہ دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی صلاحیت بے حد زیادہ رکھتے ہیں۔ اور اگرچہ دوسروں کو بولنے کا .... موقعہ وہ کبھی کم دیتے ہیں لیکن دوسروں کے مافی الضمیر کو اپنے الفاظ میں اس قدر خوبصورتی کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں کہ آدمی کے دل میں یہ کھٹکا نہیں رہتا کہ اس کی بات نہیں سنی گئی۔ اس کے علاوہ مولانا کی سنجیدگی و متانت میں معصومیت و سادگی کے ساتھ ساتھ ایک ایسی شوخی و ظرافت بھی ہے جو مخاطب کو تھکنے نہیں دیتی۔ وہ چھوٹے چھوٹے

اس ضمن میں مولانا نے تفصیل کے ساتھ یہ بتایا کہ کانگریس میں شامل ہونے کے بعد سے آج تک انھوں نے صرف یہی کوشش کی ہے کہ کانگریس کو آزادی کامل کے مطمح نظر سے اِدھر اُدھر نہ جانے دیں۔

"مگر آپ کی ان کوششوں سے عوام خصوصاً مسلم عوام بالکل ناواقف ہیں" میں نے مولانا سے کہا۔

"میرے بھائی! مولانا نے بڑی بے نیازی سے کہا" میں نے اس چیز کی آرزو کبھی نہیں کی کہ لوگ میرے بارے میں کیا جانتے ہیں اور کیا نہیں جانتے"۔

"مگر آزادی کامل تو اتنی جلدی مل بھی تو نہیں سکتی کہ ہندو کو اپنے مقاصد کی تکمیل کا موقعہ نہ ملے" ؟ میں نے موضوع گفتگو کو بدلتے ہوئے کہا۔

"یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو میرے بھائی" مولانا نے کچھ ایسے شفقت آمیز لہجے میں کہا جیسے واقعی وہ میرے بڑے بھائی ہی ہوں "مگر ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم ہندو اور مسلمان دونوں کی نگاہوں سے اس مقصد کو اوجھل نہ ہونے دیں اور برابر اسی جد وجہد میں لگے رہیں۔"

اس کے بعد مولانا نے ذرا زیادہ پُر جوش لہجے میں کہا "اور خدا کا شکر ہے کہ ہماری یہ کوشش رائگاں نہیں گئی۔ یہ ہماری ہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج آزادیٔ کامل کی تڑپ ہندوستان کے بچے بچے کے دل میں پیدا ہو گئی ہے۔ اور آج لوڈیوں کی زبان بھی آزادی کا نام لینے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتی۔

ایک غلطی

مسلم لیگ نے اسی سال لکھنؤ کے اجلاس میں "آزادیٔ کامل" کو اپنا

کو موردِ الزام ٹھہرانے کی ویسی ہی کوشش کی جائے گی جیسی عام نیشنلسٹ مسلمانوں کی طرف سے ہوا کرتی ہے۔ لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مولانا کا طرزِ استدلال ان سب سے بالکل مختلف تھا۔ کانگریس پر ہندو رجعت پسند طبقے کا جو غلبہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس پر مولانا اسی طرح نالاں تھے جس طرح کوئی کٹر سے کٹر مسلمان ہو سکتا ہے مسلمانوں ...... کی تہذیبی و معاشرتی خصوصیات و امتیازات کو باقی رکھنے پر بھی وہ اتنے ہی مصر تھے۔ جتنا کوئی مسلم لیگی ہو سکتا ہے۔ کانگریس کی ہندو اکثریت کے متعصبانہ رویے کی شکایت کو بھی انھوں نے صحیح تسلیم کرنے میں مطلق کسی پس و پیش سے کام نہ لیا۔ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو ہندو اکثریت کی متعصبانہ دستبرد سے محفوظ رکھنے کی بھی بڑی جذباتی تائید ان کی طرف سے ہوئی ـــــــــ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ان کی رائے یہ تھی کہ ہمارا پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ ہندوستان کو انگریز کے وجود سے خالی کر دیں اس لئے جب تک آزادیٔ کامل کا یہ مقصد حاصل نہیں ہو جاتا۔ ہمیں ہندو کے ساتھ مل کر اپنی جدوجہد جاری رکھنی چاہئے۔

اس پر میں نے پوچھا "مگر ہندو فوری آزادی کب چاہتا ہے۔ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ انگریز آہستہ آہستہ یہاں سے جائے تاکہ اس دوران میں ہندو اس ملک کے ہر شعبۂ زندگی پر چھاتا چلا جائے۔"

"ہاں لیجئے کہ وہ یہی چاہتا ہے۔" مولانا نے فرمایا۔ "لیکن ہمیں اس کا ہاتھ پکڑ لینا چاہیئے۔ اور جب وہ زبان سے آزادیٔ کامل کا نام لیتا ہے تو ہمیں چاہئے کہ اسے اِدھر اُدھر نہ بھٹکنے دیں۔ اور اس کے پاؤں پکڑ کر آزادیٔ کامل کی منزل کی طرف کشاں کشاں لے جائیں۔"

ازالہ کیسے ہو سکتا ہے"؟ میں ہر پھر کر بار بار اسی سوال پر آجاتا تھا۔

صحیح طاقت کیا ہے۔؟

آخر مولانا نے بڑی تفصیل کے ساتھ گذشتہ ایک صدی کے تاریخی پس منظر میں ہندو مسلم سوال کا بڑا فاضلانہ تجزیہ کر کے بتایا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے جو شکائتیں ہیں، اُن کا حل وہ ہرگز نہیں ہے جس پر آج عمل ہو رہا ہے۔ بلکہ ان کا حل یہ ہے کہ ہمارے حوصلے کی رفعت، کردار کی بلندی اور ظرف کی کشادگی اخلاقی غلبہ و اقتدار کے اس ماحول کو ترقی دے جس نے ہندوؤں میں رام موہن رائے اور پنڈت رتن ناتھ سرشار جیسے افراد پیدا کیے۔ اور جس کے اثرات آج بھی ہندوستان سے مفقود نہیں ہوئے ہیں۔ آپ نے فرمایا، تنگ فرقہ دارانہ ذہنیت کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔ اپنی قوم یا اپنے فرقے کی ہر برائی کو نظر انداز کر دینا اور دوسروں کے محاسن کو بھی معائب بنا کر پیش کرنا، اسلامی توسع اخوت کی اُس اسپرٹ کے سراسر منافی ہے جس نے پنجاب بنگال کی نصف سے زیادہ آبادی کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔ آپ نے کہا میں اسلام کی طاقت سے مایوس نہیں ہوں بلکہ میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر آج بھی صحیح اخلاقی بلندی کے ساتھ اسلام کو پیش کیا جائے تو ہندوستان کا بچہ بچہ دوڑ کر اس کے دائرے میں آجائے گا۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ تبلیغ و تنظیم کے نام سے پچھلے دنوں ہم نے جو ہنگامہ کھڑا کیا تھا۔ وہ اسلامی رُوح سے سراسر عاری تھا۔ اس لئے اس ہنگامے نے اسلام کو ہندوستان میں فائدہ نہیں نقصان پہنچایا۔ اور آج بھی فرقہ پرستی کے نام سے اسلام کا نام لے کر جو کچھ کیا جا رہا ہے۔ اس سے

نصب العین قرار دیا تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "یہ ہماری ہی جدوجہد کے آثار ہیں کہ آج مسلم لیگ کے لیڈر بھی ہوم رول کے چکر سے "آزادیٔ کامل" کا نام زبان پر لا رہے ہیں۔"

"تو پھر لیگ کے ساتھ تعاون کیوں نہ کیا جائے؟" میں نے فوراً کہا۔

"اگر تعاون سے تمہارا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں آزادی کامل کے مطالبے کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ ایک ہندو کی آزادی کامل ...... اور ایک مسلمان کی آزادیٔ کامل۔ تو یہ باہمی تصادم کی ایک ایسی شکل ہو گی جس کا فائدہ انگریز کو پہنچے گا۔"

اس کے بعد آپ نے کہا: "میں یہ جانتا ہوں کہ مسلم لیگ مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ مگر یہ نتیجہ ہے صرف اس کا کہ ہم نے کانگریسی وزارتوں میں مسلم لیگ کے نمائندوں کو نہیں لیا۔"

اس نکتے کو تفصیل سے بیان کرنے کے بعد مولانا نے فرمایا: "میری رائے یہی تھی کہ چودھری خلیق الزماں اور نواب اسمٰعیل خاں جیسے لوگوں کو وزارت میں لیا جائے۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ ہمارے نیشنلسٹ مسلمانوں نے اصول کا نام لے کر مجھے اتنا مجبور کیا کہ مجھے اپنی رائے بدلنی پڑی۔ ورنہ اگر یہ لوگ کانگریسی وزارتوں میں آجاتے تو آپ دیکھتے کہ اگرچہ کانگریسی وزیر سب کچھ دہی باتیں کرتے جو آج کر رہے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اس شور و غوغا کی کوئی ہلکی لہر بھی کسی طرف سے نہ اٹھتی جو آج طوفان بنا کر ہر طرف پھیلائی جا رہی ہے۔"

"مگر کانگریس کی ہندو اکثریت سے مسلمانوں کو جو شکائتیں ہیں، اُن کا

پوری طرح حمایت کریں گے۔ لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان کی حمایت کرنے کی بجائے مولانا نے ان کی ذہنیت پر مجھ سے بھی زیادہ شدید نکتہ چینی کی۔ آپ نے کہا۔ کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوؤں کی اکثریت ابھی نیشنل ازم کے تصور سے بہت دور ہے حتی کہ کانگریس کے ہندو لیڈروں میں بھی ایسے افراد کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جو نہایت ہی پست و رکیک قسم کی متعصبانہ تنگ نظری کے حامل ہیں۔ مولینا نے یہ بھی تسلیم کیا کہ کانگریس سے مسلمانوں کی بیزاری کے اسباب میں نام نہاد نیشنلسٹ ہندو لیڈروں کی اس متعصبانہ تنگ نظری کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔

"پھر اس کا علاج کیا ہونا چاہیئے"؟ قدرتاً مجھے یہ سوال کرنا ہی چاہیئے تھا۔

اس سوال کے جواب میں مولانا نے جو کچھ کہا۔ وہ میرے لئے بہت عجیب تھا۔ فرمایا:- مسلمانوں کو کانگریس میں جا کر اس کی اصلاح کی کوشش تو ضرور کرنی چاہیئے۔ لیکن اسی کے ساتھ انہیں اپنی جداگانہ تنظیم سے بھی غافل نہ رہنا چاہیئے۔

اس پر میں نے مسلم لیگ کا ذکر کیا تو مولانا نے پورے جوش کے ساتھ کہا کہ میں مسلم لیگ کے بنیادی اصول اور مسلمانوں کے اس طریقہ تنظیم و اتحاد کو بے حد ضروری سمجھتا ہوں لیکن اسی کے ساتھ آپ نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ لیگ کے نام سے جو تنظیم ہو رہی ہے وہ عملاً رجعت پسند مسلمانوں کی تنظیم ہو کر رہ گئی ہے۔ تاہم آپ نے لیگ میں شامل ہو کر کام کرنے سے اتفاق کیا۔ بلکہ اس امر پر زور دیا کہ مسلمانوں کو چاہیئے۔ یا تو لیگ کو ترقی پسندوں کے زیر اثر لائیں اور یا پھر مسلمانوں کی کوئی دوسری علیحدہ تنظیم کریں۔

لیکن یہ اُس وقت کی بات ہے۔ جب لیگ نے لاہور کے اجلاس میں

اسلام کی عظمت کو ہندوستان میں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔

مرکزی طاقت

کانگریس نے رجعت پسند و مسلم دشمن ہندو عناصر کی زہرافشانیوں کے مسئلے پر گفتگو فرماتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ ہمیں چھوٹی چھوٹی منفرد ٹولیوں کی حرکتوں سے بددل نہ ہو جانا چاہیئے۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا مرکزی طاقت کو ہم ٹھیک رکھ سکتے ہیں یا نہیں۔ "مرکزی طاقت" کے لفظ سے مولانا کا مطلب جو کچھ تھا اُسے آپ نے کھول کر صاف صاف لفظوں میں بیان نہیں فرمایا لیکن میں اس کا مقصد یہی سمجھا کہ مولانا کا اشارہ اپنی ذات کی طرف تھا اور آپ یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ کانگریس کا نظام جس محور پر گھوم رہا ہے اس میں ان کے اثر و اقتدار کو اتنا دخل ہے کہ وہ ہر غلط چیز کی اصلاح پر قدرت رکھتے ہیں۔ مگر آپ کی رائے میں اس اثر سے صحیح فائدہ صرف اسی صورت میں اٹھایا جا سکتا ہے جب نچلی کانگریس کمیٹیوں میں بھی مسلمانوں کا وجود ہو اور وہ وہاں بیٹھ کر غلط عناصر کے خلاف آواز بلند کرتے رہیں۔ مگر مولانا کو افسوس یہی تھا کہ چونکہ مسلمانوں نے کانگریس کو بالکل چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے وہ رجعت پسند ہندوؤں کے خلاف کانگریس کی مرکزی طاقت کی مشینری کو پوری طرح حرکت میں نہیں لا سکتے۔

مسلم لیگ

لیکن میرے لئے گفتگو کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ وہ تھا جس میں مولانا نے کانگریس کے رجعت پسند ہندوؤں کی ذہنیت پر تبصرہ فرمایا۔ میرا خیال تھا کہ کانگریس کے ایک ذمے دار رہنما ہونے کی وجہ سے وہ کانگریسی لیڈروں کی

کا ہونا ہی ہے۔ اس لیئے ان کے ناقص ہونے کی وجہ سے ہم ان کی حمایت تو بلاشبہ نہیں کر سکتے۔ مگر اصولاً ان کی مخالفت کرنا بھی غلط ہو گا۔ مولانا اپنی اس بات پر سختی کے ساتھ جمے رہے کہ پنجاب کے بڑے بڑے کانگریسیوں نے استعفوں کی کی دھمکیاں تک دیں۔ مگر مولانا ٹس سے مس نہ ہوئے اور یہ حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اگر اس سلسلے میں سر سکندر حیات خاں کی پشت پر مولانا ابوالکلام کا ہاتھ نہ ہوتا تو یہاں کے شہرۂ آفاق زرعی بلوں میں سے ایک بھی پاس نہ ہو سکتا۔ یہی حال سندھ کی سکھر بیرج اسکیم کا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں مولانا نے لیگ کی وزارتوں کی جو مدد کی اُسے لیگ کے اندرونی حلقے خوب جانتے ہیں۔ اور سر سکندر حیات خاں تو اس معاملے میں مولانا کے بیحد مداح تھے۔

کشمکش

مسلم لیگ کے لیڈروں کا تذکرہ آیا تو مولانا نے کچھ ایسے انداز میں ان کا نام لیا جس کی توقع مجھے نہ تھی۔ انھوں نے مسٹر محمد علی جناح کا نام نہایت عزت سے لیا اور یہ تسلیم کیا کہ لیگ کے لیڈروں میں وہ نسبتاً سب سے زیادہ ترقی پسند ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ آپ نے فرمایا کہ چونکہ جناح صاحب نہ تو مشرقی ذہنیت سے آشنا ہیں۔ اور نہ ہی اسلامی طرزِ فکر و عمل سے واقف ہیں۔ اس لئے ایک کامیاب سیاستدان ہونے کے باوجود وہ مسلمانوں کی سیاست میں بہت سے خطرناک عنصر شامل کر رہے ہیں۔

اس مسئلے پر تفصیل کے ساتھ اپنے بہت سے ذاتی تجربات بیان فرماتے

پاکستان کی تجویز پاس نہیں کی تھی۔ اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ اس تجویز کے بعد اب مولانا کی رائے اس بارے میں کیا ہے۔

گھر کے اندر کی کشتم کچھاڑ

کانگریس کے رجعت پسند ہندو لیڈروں کی طرف سے جو حرکتیں اندرونی طور پر ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی بعض دلچسپ کیفیتیں بھی مولانا کی اس گفتگو سے معلوم ہوئیں۔ اس وقت سندھ کی وزارت کے سامنے سکھر بیرج اسکیم کے سلسلے میں نئے ٹیکس لگانے کا سوال درپیش تھا۔ چونکہ سندھ میں بھی پنجاب کی طرح شہری آبادی میں ہندوؤں کا عنصر غالب ہے اور دیہاتی آبادی زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے ہندوؤں کا مطالبہ یہ تھا کہ یہ ٹیکس صرف دیہات پر لگایا جائے۔ مگر مولانا آزاد نے اس سلسلے میں اندرونی طور پر اس رجعت پسندانہ ذہنیت کا اتنا کامیاب مقابلہ کیا کہ آخر میں سردار پٹیل تک نے ناک بھوں چڑھالی۔ مگر مولانا کی بات چونکہ معقول تھی اس لئے آخر میں مجبوراً سب کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔

یہی صورت پنجاب میں ہوئی جب زرعی قانونوں کے خلاف ہندوؤں نے محض اس لئے شور و غوغا مچایا کہ اس طرح ہندو سرمایہ داروں اور ساہوکاروں کو نقصان پہنچتا تھا اس سلسلے میں ایک دلچسپ لطیفہ مولانا کی گفتگو سے یہ معلوم ہوا کہ جب ہندو مہا سبھا نے ان قانونوں کے خلاف یوم احتجاج منانا چاہا تو پنجاب کے کانگریسی ہندوؤں نے کانگریس کو بھی اس میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ مگر مولانا نے اس کی مخالفت کی۔ آپ نے فرمایا کہ اگرچہ یہ قانون عوام کو سو فی صدی فائدہ نہیں پہنچاتے مگر پھر بھی ان سے کچھ نہ کچھ فائدہ تو کاشتکار

میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اور جن میں مسلمانوں کو تبلیغ کی گئی ہے کہ ہندوؤں اور انگریزوں دونوں سے بے نیاز ہوکر اپنی ذات پر بھروسہ کریں۔ اور اپنے ہر عمل کی بنیاد اُسوۂ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قرار دیں۔ مولانا نے فرمایا کہ میں اپنے اقوال سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹا ہوں۔ لیکن خلافت کی تحریک کے وقت ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اسلام کی آزادی و برتری کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہندوستان کو انگریز کے وجود سے خالی کر دیا جائے۔ اور اس مقصد کے لئے ہندو کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ آپ نے کہا کہ میں اس فیصلے کو آج بھی اس طرح صحیح سمجھتا ہوں جس طرح ۱۹۲۱ء میں صحیح سمجھتا تھا۔ اور صرف اسی مقصد کی خاطر کانگریس سے تعاون کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

مسلمانوں کے جُداگانہ کلچر اور تہذیب کے سوال پر آپ نے فرمایا کہ میں ایک لمحے کے لئے بھی یہ نہیں مان سکتا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں میں ضم ہو جانا چاہیئے۔ آپ نے کہا "ہمیں ہر در و دیوار پر یہ نقش کر دینا چاہیئے کہ ہماری ایک جُداگانہ تہذیب و مدنیت ہے جس کا ایک نقش مٹانا بھی ہم گوارا نہ کریں گے۔"

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مولانا کی گفتگو کے جو الفاظ میں نے اُوپر نقل کئے ہیں۔ ان میں اگرچہ کوشش یہی کی گئی ہے۔ کہ انہی کے الفاظ کو پیش کیا جائے مگر سات آٹھ سال کے واقعہ کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میرے حافظے نے غلطی نہیں کی اس لئے مفہوم تو بلاشبہ صحیح ہے۔ مگر الفاظ اکثر جگہ وہ نہ رہے ہوں گے جو مولانا نے اپنی زبان سے ادا کئے۔

❖ ❖ ❖

ہوئے مولانا نے فرمایا۔ مسٹر جناح کی موجودگی میں لیگ کی اصلاح ناممکن ہے۔ آپ نے کہا۔ لیگ کے تصور تنظیم کا مجھ سے زیادہ حامی اور کون ہوگا۔ مگر اس وقت لیگ کے افکار و تصورات کی عمارت جن بنیادوں پر قائم ہے۔ میں اس کی حمایت نہیں کرسکتا۔ آپ نے فرمایا۔ مسلمانوں کے قافلے کو اسلامی اصول کے جادۂ مستقیم پر اجتماعی شکل میں گامزن ہوتا دیکھنا میرے برسوں کے خواب کی تعبیر ہے لیکن لیگ کے نام سے جو قافلہ تیار ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔

میں نے کہا۔ پھر لوگ آپ کو چھوڑ دیں گے۔؟

ہنس کے بولے۔ مگر آپ کی رائے یہ ہے کہ میں لوگوں کے ڈر سے اپنے ان اصولوں کو چھوڑ دوں جن کو میں اسلام وایمان کی بنیاد سمجھتا ہوں۔؟

کانگریسی ہندؤوں کی رجعت پسندانہ ذہنیت کا جب ذکر آیا تو مولانا نے کہا کہ اگرچہ اس قسم کی افسوسناک ذہنیت کا وجود کانگریس میں بلاشبہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود بہت سے ایسے ہندو بھی ہیں جو اس ذہنیت سے پاک ہیں۔ اور اگر ہم ان کے ہاتھ مضبوط کریں تو راہ کے بہت سے کانٹے ہٹائے جاسکتے ہیں۔" لیکن" آپ نے افسوس کے ساتھ کہا" ہمارا موجودہ طرز عمل یہ ہے کہ ہم جواہر لال جیسے لوگوں کو بھی آہستہ آہستہ سادر کر اور مونجے کی طرف دھکیلتے جارہے ہیں۔"

ماضی اور حال۔

سلسلۂ سخن میں مولانا کے اُن مضامین کا تذکرہ بھی آیا جو الہلال و البلاغ

کے لحاظ سے انہیں وہ نہیں کہہ سکتے جسے انگریزی میں " پالیٹیشن " کے لفظ
سے تعبیر کرتے ہیں ۔ وہ عوام کو قابو میں لانا اور سیاسی داؤ پیچ کے مطابق انہیں
مطمئن کرنا نہیں جانتے ———— اور یہی ان کی وہ کمی ہے ۔ جسے
دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ :۔

بے عیب ذات صرف خدا کی ہے

کیا یہ شمع سحر گاہی ہے؟

لیکن مولانا کی اس گفتگو میں جس نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کی مشرقی تہذیب کا وہ نادر نمونہ تھا جو اب دہلی اور لکھنؤ کے چند مخصوص گھرانوں کے سوا عام طور پر بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ ان کا تبسّم، ان کے الفاظ کی بندش، ان کی خاطر و مدارات کا ڈھنگ، ان کی نشست و برخاست کا سلیقہ، ان کی گفتگو کا انداز، غرض ہر چیز کا سانچہ ٹھیک وہی تھا جسے ہندوستان کے مسلم کلچر کا بہترین بلکہ مثالی نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ مگر میں ان سے باتیں کر رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ کیا اب یہ کلچر واقعی مسلمانوں میں باقی رہنے والا ہے۔؟

مولانا کی شراب نوشی کے چرچے میں نے بہت سُنے تھے۔ اس لئے خاموشی کے ساتھ میں نے سب سے زیادہ تحقیق اسی کی کی۔ اس سلسلے میں فن سراغرسانی کے اصول کے مطابق ان کے قریب کے آدمیوں اور نوکروں سے میں نے بہت کچھ کھوج لگائے اور آخر میں یقینی طور پر اسی نتیجے پر پہنچا۔ کہ ممکن ہے پچھلے زمانے میں ان پر کوئی دور اس معصیت کوشی کا آیا ہو۔ مگر اب تو ان کی زندگی اسلامی آداب و اصول کے سانچے میں ایسی ڈھلی ہوئی ہے کہ دیکھ کر رشک آتا ہے۔

مضمون کافی طویل ہو گیا اس لئے اب میں اسے ختم کرتا ہوں۔ البتہ آخر میں اتنا ضرور کہوں گا۔ کہ "بڑے لوگوں" سے ملنے کے بعد میں کبھی کسی سے اتنا متاثر نہیں ہوا جتنا مولانا سے ہوا۔ تاہم میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ بزرجمہر اور ارسطو کی طرح ایک غیر معمولی زیرک و مدبر انسان تو بلاشبہ ہیں لیکن عملی سیاسیات

کی کوئی گردش آپ کو نیچے سے اٹھا کر اوپر بٹھا دیتی ہے۔ جس کے نتیجے میں آپ گمنامی کے اندھیرے سے نکل کر شہرت کی بھرپور روشنی میں آجاتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر "بڑا آدمی" صرف حالات وماحول کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور اس میں ذاتی طور پر کوئی غیر معمولی استعداد وصلاحیت نہیں ہوتی۔ مطلب صرف یہ ہے کہ اگرچہ بعض "بڑوں" کی دماغی وذہنی صلاحیت بھی غیر معمولی ہوتی ہے۔ لیکن ہر "بڑے آدمی" کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس میں حیرت ناک قسم کی کوئی استثنائی طاقت لازماً ہو۔ یہی منطقی قضیئے کی شکل میں اسے یوں سمجھئے کہ غیر معمولی صلاحیت وقابلیت ہر بڑے آدمی میں نہیں ہوتی لیکن بعض میں ہوتی ہے یعنی سالبہ کلیہ کا نقیض موجبہ جزئیہ ہے ——— مثلاً لارڈ ویول یقیناً بڑا آدمی ہے۔ لیکن وہ کوئی غیر معمولی ذہانت وفطانت کا آدمی ہرگز نہیں۔ اس کے مقابلے میں برنارڈ شا بڑا بھی ہے اور ذہنی وفکری لحاظ سے عام سطح سے بہت بلند بھی ہے۔ اول الذکر شخصیت حالات وماحول کی پیداوار ہے جس نے اپنی معمولی صلاحیتوں کو جِلا دے کر محنت وکوشش سے یہ رتبہ حاصل کیا ہے۔ لیکن ثانی الذکر شخصیت میں چند خداداد صلاحیتیں ایسی ہیں جو بہت کم لوگوں میں ہوتی ہیں ——— اور یہی وہ فرق ہے۔ جو "بڑے آدمی" اور "عبقری" یا "جی نی اَس" میں ہوتا ہے۔ بڑا بننا کسبی بھی ہو سکتا ہے لیکن عبقری یا جی نی اَس ہونا صرف وہبی ہے۔ پہلی صفت آپ اپنی سعی وکوشش سے پیدا کر سکتے ہیں لیکن دوسری چیز صرف خدا کی دَین پر موقوف ہے ؎

این سعادت بزور بازو نیست ✽ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

جی نی اس یا عبقری

سطور بالا میں مولانا ابوالکلام آزاد کو ایک "بڑے آدمی" کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن آئیے اب ایک دوسرے آئینے میں انھیں دیکھنے کی کوشش کریں۔

"بڑے آدمی" کا لفظ بہت مبہم سا ہے۔ "بڑے آدمی" کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس کی ذہنی و دماغی صلاحیت بھی عام آدمیوں سے بڑی ہو۔ اس کے برعکس ایک معمولی آدمی بھی بڑا ہو سکتا ہے بشرطیکہ کسی وجہ سے اس سے کوئی ایسا کام صدور پذیر ہو جائے جو ایک ہنگامہ سا بپا کر دے، خواہ وہ ہنگامہ عارضی ہو یا مستقل۔ افغانستان کا "بچہ سقہ" اپنی ذہنی و دماغی صلاحیتوں کے لحاظ سے ایک معمولی انسان سے زیادہ نہ تھا۔ مگر حالات کے چکر نے اُسے ہنگامی و وقتی طور پر دنیا کی نگاہوں کا مرکز بنا دیا اور وہ بھی "بڑا آدمی" کہلانے لگا۔

اصل یہ ہے کہ بڑا بننے کے لئے ہمیشہ ہی غیر معمولی دماغی و ذہنی صلاحیت کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ حالات و واقعات

کی جو خداداد قابلیت جناح و سپرو میں ہے اس کا مقابلہ مشکل ہی کوئی کرسکتا ہے۔ اور اسی چیز نے انھیں اپنے تمام ہم پیشہ وکلا پر فوقیت دے رکھی ہے۔

اُردو میں "جی نی اس" کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے۔ عربی میں البتہ اس کے لئے "عبقری" لفظ مستعمل ہوتا ہے جو بہت موزوں ہے۔ کیونکہ "عبقر" اس جنگل کو کہتے ہیں جو جنوں کا مسکن ہو۔ اور غالباً اسی لئے قدیم عربی میں "عبقری" کا لفظ اعلیٰ اور بہتر کے لئے مستعمل ہوتا تھا۔ اب اسے "جی نی اس" کے لئے بولا جاتا ہے "جی نی اس" کے معنی یہ ہیں کہ وہ کسی خاص لائن میں وہبی طور پر تخلیق و اجتہاد کی قوت کا مالک ہو۔ وہ بات میں بات پیدا کرسکتا ہو۔ اور نئے نئے نکات ایجاد کرسکتا ہو۔ مثلاً ٹیگور کے متعلق کہا جاسکتا ہے۔ کہ وہ موسیقی کا "جی نی اس" تھا۔ اس لئے کہ اس نے بیسیوں نئے راگ ایجاد کئے ہیں۔

بہر حال چونکہ اردو میں عبقری یا جی نی اس کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے۔ اس لئے ہم نے اس کی وضاحت کیلئے ذرا زیادہ تفصیل سے اسی لئے کام لیا ہے۔ تاکہ صحیح مفہوم آپ کے ذہن میں آجائے۔

اب آیئے اس مختصر سی تمہید کے بعد یہ دیکھیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے خط و خال اس آئینے میں کیسے نظر آتے ہیں۔

"جی نی اَس" دراصل رومن زبان کا لفظ ہے جو، اب انگریزی زبان کا
جزو بن گیا ہے۔ قدیم رومیوں کے عقائد (   ) ہیں
"جی نی اَس" (   ) دراصل پیدائش و ازدواج کے دیوتا
کا نام تھا۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ جب کوئی آدمی، خواہ مرد ہو یا عورت، دنیا میں
پیدا ہوتا ہے۔ تو اس کے ساتھ اس کا ایک محافظ بھی آتا ہے جو ہمزاد کی طرح
زندگی بھر اس کے دم کے ساتھ لگا رہتا ہے اور ہر خطرے اور مصیبت سے
اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اسی محافظ کو وہ "جی نی اَس" کے لفظ سے تعبیر
کرتے ہیں ۔ اور ان کا خیال تھا کہ انسان میں نیکی و بدی کا میلان اسی کی اثر
اندازی کا نتیجہ ہوتا ہے ۔

لیکن جب رومیوں نے عیسائی مذہب قبول کیا۔ اور ان کے پچھلے عقائد
آہستہ آہستہ ختم ہونے شروع ہوئے تو "جی نی اَس" کا لفظ آدمی کی پیدائشی
اور خلقی صلاحیتوں کے لئے مستعمل ہونے لگا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ لفظ صرف
ان صلاحیتوں اور قابلیتوں کے لئے مستعمل ہونے لگا جو عام آدمیوں میں نہ
ہوں۔ اس لئے آج کل "جی نی اس" کے لفظ سے وہ شخص مراد ہوتا ہے۔ جو
کوئی غیر معمولی قسم کی استثنائی صلاحیت ایسی رکھتا ہو جو معمولاً لوگوں میں نہ پائی
جاتی ہو اور جسے کسب و سعی سے حاصل بھی نہ کیا جا سکتا ہو۔ مثال کے طور پر مسٹر
محمد علی جناح اور سر تیج بہادر سپرو کو لیجئے۔ انھیں "قانونی جی نی اَس" کہا جاتا ہے
اس لئے کہ اگرچہ تعلیمی اعتبار سے یہ اپنے ہم عصروں کے برابر ہیں۔ بلکہ بعض تو
ان سے کہیں زیادہ قانونی مطالعہ رکھتے ہیں۔ مگر قانونی نکتہ آفرینی و موشگافی

سے سخت جذباتی موقعوں پر بھی قلب و دماغ کے سکون کے ساتھ غور کرنے کی حیرتناک صلاحیت اپنے اندر رکھتے ہیں اور اپنے مخاطب کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی قابلیت تو ان میں اتنی زبردست ہے کہ آدمی انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ وہ گفتگو کرتے ہیں تو جملے ایسے گفتگو کر سکتے ہیں کہ اگر مختصر نویسی کے اصول پر اسے قلمبند کر لیا جائے۔ تو کوئی ایک جملہ بھی ادب و انشاء کے معیار بلند سے گرا ہوا نظر نہ آئے ——— اور یہی وہ تمام صفات ہیں جو مل جل کر انھیں ہر مجلس میں میر مجلس کا درجہ دے دیتی ہیں اور یہی وہ فطری صلاحیتیں ہیں جن کی بنا پر بائیس[۲۲] تئیس[۲۳] سال کی مختصر سی عمر میں الہلال والبلاغ کی حیثیت سے خطابت و انشاء کی دنیا میں انھوں نے یکتائی کا منصب حاصل کر لیا تھا۔ ورنہ تعلیمی لحاظ سے وہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ ان کے پاس دنیا کی کسی درسگاہ کی سند فضیلت نہیں ہے اور نہ کسی کالج یا مدرسے میں انھوں نے باقاعدہ تعلیم پاکر کوئی ڈگری حاصل کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود حالت یہ ہے کہ آج ہندوستان کے بڑے بڑے جیّد علماء جب ان سے ملتے ہیں۔ تو ان کی استعداد و صلاحیت کا لوہا مانے بغیر نہیں رہ سکتے۔ حد یہ ہے کہ ہندوستان میں مولانا ابوالکلام ہی پہلے شخص ہیں جو چونتیس[۳۴] سال کی مختصر سی عمر میں پہلی بار (۱۹۲۳ء میں) آل انڈیا کانگریس کے صدر بنائے گئے اور جو اس نوجوانی کے باوجود حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، گاندھی، موتی لال اور سی آر داس جیسے لوگوں کی صف میں ممتاز حیثیت سے نظر آنے لگے۔ ورنہ غور کیجئے کہ معمولی تعلیم یافتہ انسان اور وہ بھی ایسا جو انگریزی بول سکتا ہو نہ لکھ سکتا ہو۔ اسے سی آر داس اور مولانا محمد علی جیسے زبردست علم و بصیرت رکھنے والوں کی صف میں کوئی جگہ کیسے مل سکتی تھی۔ خلافت کی تحریک

ہر مجلس کا میر مجلس

انبیاء کرام کو چھوڑ کر کسی شخص کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ہر حیثیت سے کامل ہے۔ مولانا ابوالکلام بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ البتہ اتنا یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ادب وانشاء اور خطابت، وقیادت کے لحاظ سے وہ ایک "جی نی اس" کی طرح عام سطح سے بہت بلند ہیں۔ اُن کا طرز گفتگو، اُن کا لب و لہجہ اور ان کا عام انداز قدرتی طور پر ایسا ہوتا ہے۔ کہ وہ جس مجلس میں بیٹھیں گے۔ وہاں چھا جائیں گے۔ خدا نے ان کو حافظے کی قوت اتنی بے پناہ دے رکھی ہے کہ عربی فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار انہیں زبانی یاد ہیں جنہیں وہ بڑی بے ساختگی کے ساتھ برجستہ پڑھ سکتے ہیں۔ مزید براں جو کتاب ان کے مطالعے میں ایک مرتبہ آجاتی ہے۔ اس کی عبارتیں انھیں حفظ ہو جاتی ہیں اور جب موقعہ آتا ہے۔ تو وہ اس درجہ روانی کے ساتھ اُن کے حوالے دہرانے شروع کر دیتے ہیں کہ سننے والا محو حیرت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس طرح لطائف وظرائف کی ایک کان ہے جو ان کے سینے میں ہر وقت محفوظ رہتی ہے اور وہ اس کان پر اس قدر قابو بھی رکھتے ہیں کہ جب اور جس وقت چاہتے ہیں۔ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ وہ سخت

ہرگز نہیں ہیں جیسے ہماری زبان میں "پولیٹیکل آدمی" کہا جاتا ہے۔ وہ معاملہ فہم ہیں۔ نکتہ رس ہیں لیکن "چلتا پُرزہ" مطلق نہیں ہیں۔ اور یہی ان کا وہ عیب ہے جو سیاست کے میدان میں ہمیشہ اُن کے آڑے آیا اور جس نے آج اُن کی شہرت و ہر دلعزیزی کے آفتاب کو داغدار بنا کے رکھ دیا ہے۔ وہ موقعہ کو پہچان سکتے ہیں۔ لیکن موقعہ کے مطابق خود کو ڈھال نہیں سکتے۔ وہ زمانے کی ادا کو دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن زمانے کی اداؤں کا ساتھ دینا گوارا نہیں کر سکتے۔ وہ عوام کی ذہنیت کو جان لے سکتے ہیں۔ مگر عوام کو مطمئن کرنے کے لئے اپنی سطح سے نیچے نہیں اتر سکتے۔ وہ شور و ہنگامے میں اپنے قلب و دماغ کا سکون باقی رکھ سکتے ہیں۔ لیکن شور و ہنگامے کا جزو بن کر اپنا کام نکالنے کی کوشش نہیں کر سکتے، وہ لوگوں کے چہروں پر پڑے ہوئے نقابوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن خود اپنے چہرے پر نقاب ڈالنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہی نہیں بلکہ وہ دوسروں کے نقابوں کو نوچ کر پھینک دینے کی اخلاقی گراوٹ کو بھی بمشکل ہی برداشت کر سکتے ہیں۔ وہ اپنے حریف پر ہنس سکتے ہیں۔ مگر اسے نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ وہ تکلیف اٹھا سکتے ہیں۔ مگر انتقام نہیں لے سکتے، وہ گالیاں سُن سکتے ہیں۔ مگر دے نہیں سکتے۔ وہ اپنے کٹر سے کٹر دشمن کو معاف کرنے کے لئے اونچے سے اونچے اُٹھ سکتے ہیں۔ لیکن اس سے بدلہ لینے کے لئے اپنی سطح سے ایک انچ بھی نیچے نہیں آ سکتے ہیں۔ وہ زمانے کی ناسازگاری پر کڑھ کڑھ کر بیمار ہو سکتے ہیں۔ لیکن لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے ایک لفظ الغیاث بھی زبان پر نہیں لا سکتے ——— پھر یہ صفات انسانیت کے لحاظ سے انھیں کتنا ہی

میں ہندوستان کے تمام علماء شریک تھے۔ ان میں دیوبند کے شیخ الہند اور فرنگی محل کے مولانا عبدالباری جیسے پیکرانِ علم و فضل بھی تھے اور دیانت و تقویٰ کے مجسمے بھی۔ مگر ہندوستان کی ملی جلی جماعت کی قیادت و صدارت کے لئے نگاہِ انتخاب جب اٹھی تو مولانا ابوالکلام ہی پر پڑی۔ حالانکہ نہ تو ان کے پاس زر و مال کا کوئی ڈھیر تھا اور نہ تعلیمی اسناد و امتیازات کا کوئی پشتارہ، نہ ان کی تائید کرنے والی کوئی مخصوص پارٹی تھی اور نہ سیاسی ڈپلومیسی کی قسم کی سازشوں کا جال پھیلانے والے خودغرض مریدوں اور ارادت مندوں کا کوئی حلقہ ——— مگر اس کے باوجود ہر شخص کی نگاہیں اُن ہی کی طرف اٹھتی تھیں اور ہر انگلی انہی کی طرف اشارہ کرتی نظر آتی تھی۔

کیوں ——— ؟

صرف اس لئے کہ قدرت نے ادب و انشاء اور خطابت و قیادت کی جو "عبقریت" جو "جی نی اس" اور جو مجتہدانہ امتیاز ان کو عطا کر رکھا ہے۔ اُس کی کوئی اور مثال ہندوستان تو کیا دنیا بھی مشکل ہی سے پیش کر سکتی ہے۔ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

سیاست دان یا مُدبّر

لیکن یہاں یہ بتا دینے کی ضرورت ہے کہ جب ہم مولانا کو "قیادت کا عبقری" لکھتے ہیں تو ہماری بحث سے وہ مفہوم یقیناً خارج ہوتا ہے۔ جسے انگریزی میں "پالی ٹی شین" (   ) کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

مولانا اسٹیٹس مین ہیں۔ ایک بیدار مغز مدبّر ہیں۔ لیکن وہ اس قسم کے پالی ٹی شی اَن،

ذات کی نسبت جھوٹی باتوں کا اتنا طومار جمع ہوگیا ہے۔ اور ان کو اتنی بار دُہرایا گیا ہے کہ اب لوگ ان کو صحیح سمجھنے لگے ہیں۔ اگر مولانا میں یہ کمزوری نہ ہوتی کہ وہ اپنے مخالفوں کے جواب میں خاموش رہیں تو آج بہت سی غلط فہمیاں دور ہو سکتی تھیں۔ مگر مولانا نے نہ کبھی خود اس طرف توجہ کی اور نہ اس سلسلے میں اپنے دوستوں اور ہوا خواہوں کی حوصلہ افزائی کرنی ہی پسند کی۔

مخالفوں کے طعن و تشنیع پر خاموش رہنے کے معاملے میں بعض اوقات مولانا کی خود داری اتنی بڑھ جاتی ہے کہ ایک واقف کار انسان کو ان پر غصہ بھی آتا ہے اور رحم بھی۔ چنانچہ پچھلے دنوں کا واقعہ ہے کہ جب ان کی تفسیر کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ تو بہت سے لوگوں نے محض اس بنا پر اسے ہدف مطاعن بنانا شروع کیا۔ کہ مولانا کانگریس کے ممبر کیوں ہیں۔ جس طرح کانگریس کی ممبری کی وجہ سے کلکتہ میں ان کی امامت کے خلاف ہنگامہ اٹھایا گیا تھا۔ اسی طرح ہمارے بھائیوں کے ایک طبقے نے مولانا کی تفسیر کو بھی "کانگریسی تفسیر" کا لقب دے کر اس کے خلاف شور مچانا شروع کر دیا۔

مولانا نے اس تفسیر میں دوسرے مذاہب کا احترام کرنے اور ان کے بنیادی عقائد کو مبنی بر صداقت سمجھنے پر جو بحث کی ہے۔ وہ قرآن کریم کی اُن آیات کے مطابق ہے جن میں تمام انبیاء علیہم السلام کو برحق قرار دیا گیا ہے۔ قرآن شریف نے "صحف قدیمہ" کو تو الہامی مانا ہے۔ لیکن ان کے ماننے والوں پر تحریف و تاویل کا جرم عائد کر کے اصل دین کو مسخ کر دینے کی ذمہ داری ان کی گردن پر ڈالی ہے مولانا نے اپنی تفسیر میں اسی حقیقت کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مگر

بلند انسان کیوں نہ بنادیں۔ لیکن ایک کامیاب سیاست داں کی حیثیت سے (اور وہ بھی ہندوستان میں) ایک کامیاب لیڈر مشکل ہی بنا سکتی ہیں۔

کمزوری

انسانی فطرت کی یہ ایک عام کمزوری ہے کہ جب ہم کسی سے ناراض ہوتے ہیں۔ تو اس کے محاسن و معائب میں امتیاز کرنا بھول جاتے ہیں۔ پھر ہم کو اس کی اچھی باتیں بھی بُری لگتی ہیں اور اس کے حُسن و جمال کا نکھار بھی ہمارے آئینۂ مخالفت کے زنگار میں زنگ آلود ہو کر رہ جاتا ہے۔ مولانا ابوالکلام کے سیاسی مسلک سے مسلمان ٹھیک اس وقت سے ناراض ہیں، جب خلافت کی تحریک کا جوش سرد پڑ جانے کی وجہ سے کانگریس کی طرف سے مسلمانوں کی دلچسپی کم ہونی شروع ہوگئی تھی۔ لیکن مولانا کی ایک بہت بڑی خصوصیت استقلال و ثبات قدم ہے۔ ان کی زندگی کی پوری تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ وہ اپنے کسی فیصلے سے پھر گئے ہوں۔ وہ بہت سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھاتے ہیں۔ اور جب ایک بار اٹھا لیتے ہیں تو پھر پیچھے ہٹنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اسی بنا پر مولینا محمد علی مرحوم انھیں "ضدی مزاج مولوی" کہا کرتے تھے۔ فلسفۂ اخلاق کی رُو سے استقلال کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی شکل ہی کو "ضد" کہتے ہیں۔ اس لئے مولانا محمد علی نے اگر ابوالکلام کے استقلال کو ضد سے تعبیر کیا تو کچھ زیادہ تعجب کی بات نہیں لیکن تعجب اس وقت ہوتا ہے جب بعض لوگ سیاسی اختلاف کی بنا پر اتنے جوش میں آجاتے ہیں کہ مولانا کی ذات کے ساتھ بالکل بے بنیاد بے اصل باتیں منسوب کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ چنانچہ گزشتہ بیس پچیس سال میں مولانا کی

مولانا کی اس کھلی ہوئی توضیح کے بعد لوگوں نے درخواست کی کہ تفسیر کے دوسرے ایڈیشن میں آپ اس مسئلے کو ذرا زیادہ صاف کردیں تاکہ مخالفوں کو مجالِ اعتراض نہ رہے۔ مگر مولانا کی "خود داری" کا جواب اس پر صرف یہ تھا: "میں دفع دخل مقدر کا قائل نہیں ہوں۔ میرے بھائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تفسیر کی پہلی جلد میں اس کا کوئی موقعہ نہیں۔ البتہ تیسری جلد میں سورۂ احزاب کی تفسیر جب آئے گی۔ اُس وقت میں اس چیز کو کھولوں گا۔"

لیکن آج دس بارہ سال ہونے کو آئے۔ مگر نہ تو یہ تیسری جلد شائع ہوئی، اور نہ مولانا کا کوئی اور توضیحی بیان۔

رُوح کے لئے جسم کی قربانی

یہ ہماری قومی بدنصیبی ہے کہ مولانا نے ایک ایسے سیاسی عقیدے سے وابستہ ہونے کا فیصلہ کیا ہے جس سے عام مسلمان متفق نہیں ہیں۔ ....

....

پھر چونکہ ہمارا سیاسی شعور ابھی بالکل ابتدائی منزلوں سے گذر رہا ہے۔ اس لئے اختلاف رائے کا جو احترام ترقی یافتہ ملکوں میں نظر آتا ہے۔ وہ ہمارے یہاں مفقود ہے لیکن وقت آئے گا جب ہندوستان کے مسلمان اس بات پر فخر کریں گے کہ دنیا کی اتنی حیرت ناک شخصیت ان کے درمیان پیدا ہوئی۔ انسانی تاریخ کا یہ بھی ایک عجیب و غریب المیہ ہے کہ بڑے لوگوں کی عظمت و قدرشناسی کا ستارہ عموماً ان کی موت کے بعد چمکتا ہے۔ اور حالات یہ بتلاتے ہیں کہ شاید مولانا کے ساتھ بھی زمانے کا ہاتھ یہی المناک سلوک کرنے والا ہے۔ مولانا کی عمر اس وقت چھپّن سال سے اوپر ہے

یاران شاطر نے مولانا کی اس توضیح پر تحریف و تاویل کا گُر استعمال کرکے، اصل مُدّعا کو مسخ کرکے رکھ دیا اور یہ ظاہر کیا کہ مولانا تو تمام مذہبوں کو برحق مانتے ہیں۔ اور اسلام کو "ناسخ ادیان" قرار نہیں دیتے۔

یہ آواز پہلے آہستہ آہستہ اُٹھی مگر پھر اس میں زور پیدا ہونا شروع ہوا۔ اور آخر اچھے اچھے لوگ اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ مگر مولانا کی وہ خودداری جو مخالفوں کے مقابلے میں شاذونادر ہی لب کشائی کے لئے تیار ہوتی ہے۔ ان اعتراضات کے جواب دینے میں مانع رہی۔ البتہ جو لوگ ذاتی طور سے ان سے پوچھ تاچھ کر سکتے تھے۔ ان کو مطمئن کرنے میں وہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔ یہ دیکھ کر لوگ ان سے کہتے تھے۔

"آخر آپ یہی سب باتیں شائع کیوں نہیں کر دیتے"؟

مگر اس قسم کے ہر سوال کا ایک ہی جواب ان کے پاس تھا۔ "اس قسم کی بحثوں میں اُلجھنے سے کیا فائدہ ہے میرے بھائی؟ جس کسی کو تحقیقِ حق مطلوب ہوتی ہے وہ براہ راست مجھ سے پوچھ لیتا ہے۔ لیکن جن لوگوں کا مقصد صرف اعتراض ہی کرنا ہے۔ انہیں آپ جتنا زیادہ چھیڑیں گے۔ اتنا ہی زیادہ وہ چڑیں گے۔ اس لئے ان کا معاملہ تو خدا پر چھوڑ دیئے۔"

لیکن مولانا کی یہ دلیل بہت کم لوگوں کو مطمئن کر سکتی تھی۔ آخر ایک ہواخواہ نے انھیں خط لکھا اور مولانا کا جو جواب آیا اسے شائع کر دیا۔ جواب بہت مختصر تھا۔ اور اس میں صاف طور سے تحریر تھا کہ میں دین اسلام کو ناسخ ادیان مانتا ہوں اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور مذہب کا دامن تھامتا ہے اُسے کافر جانتا ہوں۔

"دہی جو لیڈروں اور پبلک سپیکروں کو ہوا کرتا ہے۔" ڈاکٹر نے ہنس کر کہا۔
" مگر مولانا تو عام جلسوں اور ہنگاموں میں شاذونادر ہی شریک ہوتے ہیں۔"
میں نے ڈاکٹر پر اعتراض کرتے ہوئے پوچھا۔
" اس سے کیا ہونا ہے۔" ڈاکٹر نے جواباً کہا " اصل چیز جذباتی ہیجان ہے۔
مولانا صبح سے شام تک اسی ہیجان میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اخبار ہم اور آپ سب ہی
پڑھتے ہیں لیکن مولانا کی قسم کے لوگوں کے لئے ہر خبر دل کی دھڑکن پر براہ راست اثر
ڈالتی ہے۔"
اس کے بعد ڈاکٹر نے ذرا سنبھل کے مزید کہا " پھر اسے بدنصیبی کہئے ، یا
خوش نصیبی کہ مولانا کی طبیعت بے حد حسّاس ر ، واقع
ہوئی ہے جس پر قابو پانے کے لئے مولانا اپنے دماغ وفہم کی پوری طاقت صَرف
کر دیتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹری اصول سے یہ چیز اعصاب کے لئے اتنی خطرناک ہے کہ
بیان سے باہر۔ اگر مولانا ضبط و برداشت کی مشق کرنا چھوڑ دیں۔ اور غم وغصے
کا جو احساس جس طرح آئے اسے بے ساختہ زبان پر آئیں تو اُن کا آدھا مرض کم
ہو سکتا ہے۔"
" پھر بھی آدھا ہی مرض کم ہوگا" ؟ میں نے جرحی سوال کیا۔
"جی ہاں صرف آدھا ، پورا مرض صرف اس صورت میں جا سکتا ہے۔ جب
مولانا پبلک لائف سے بالکل الگ ہٹ جائیں۔ اور مکمل طور سے سکون کی زندگی
بسر کریں۔"
یہ سنکر مولانا ہنس دیئے اور پھر اپنی عادت کے مطابق نہایت لطیف انداز

یہ عمر کچھ زیادہ نہیں لیکن حالات کی ناسازگاری اور زمانے کی ناساعدت نے ان کے اعصاب کی قوت کو بالکل ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ ایک عرصے سے خون کے بڑھتے ہوئے دباؤ (ہائی بلڈ پریشر) کے مریض ہیں۔ اور اعصابی کمزوری کا شکار تو وہ سالہا سال سے ہو چکے ہیں۔ جب میں پہلی مرتبہ ۱۹۳۶ء میں اُن سے ملا تو میں نے ان کی میز پر کتابوں اور کاغذوں کے ہجوم میں دواؤں کی مختلف شیشیاں بھی رکھی ہوئی دیکھیں۔ سب سے پہلے جینا سپرین کی شیشی پر میری نظر پڑی۔ اور میں نے مولانا سے پوچھا۔

"اس کی کیا ضرورت پیش آ گئی مولانا آپ کو" ؟

"ضرورت کا کیا سوال ہے۔ میرے بھائی" مولانا نے ایسے لہجے میں فرمایا۔ جیسے کوئی تھک کر کہتا ہے "انہی دواؤں پر تو زندگی قائم ہے"

"کیا آپ کا مزاج کچھ ناساز ہے" ؟

نہیں کوئی خاص بات نہیں۔ لیکن دواؤں کا سلسلہ تو اب برسوں سے چل رہا ہے"

اس کے بعد دوسری مرتبہ جب میں گیا تو گفتگو کے دوران میں مولانا کے معالج خصوصی بھی آ گئے۔ مولانا نے اس سے اس طرح باتیں کیں جیسے مرض کی کوئی خاص اہمیت ان کے نزدیک نہیں۔ ڈاکٹر نے انجکشن پر زور دیا۔ مگر مولانا نے ہنس کر فرمایا۔ فی الحال اس کو رہنے ہی دیجئے۔

جب مولانا سے ڈاکٹر کی گفتگو ختم ہو گئی تو میں نے اس سے پوچھا۔

"مولانا کو مرض کیا ہے" ؟

آخر ۱۹۳۶ء میں میں نے قطعی طور پر ان سے کہہ دیا کہ اب میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ مگر اس کے فوراً ہی بعد نئے انتخاب آ گئے اور سیاسی رفیقوں نے اصرار کیا کہ اس مرحلے کو گذر جانے دیجئے۔ چنانچہ اب میں عنقریب ہی اپنے اس فیصلے کا اعلان کرنے والا ہوں۔"

سے موضوعِ گفتگو بدل دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر چلا گیا۔ مگر میرے دماغ پر مولانا کی بیماری کا تصور بدستور چھایا رہا۔ میں نے ان سے کہا۔

"ڈاکٹر کی باتیں سن کر تو مجھے بڑی وحشت ہوئی۔"

میرا یہ جملہ سُن کر مولانا ہنس دیئے۔ پھر فرمایا "روح کو زندہ رکھنے کے لئے جسم کی قربانی دینی ہی پڑتی ہے۔"

پھر بولے "صحت کی خاطر تو نہیں، البتہ ان کاموں کی خاطر جو میرے پیشِ نظر ہیں۔ میں عرصے سے یہ سوچ رہا ہوں کہ سیاست سے بالکل کنارہ کش ہو جاؤں۔ تصنیف و تالیف کے بہت سے ایسے کام ہیں جن کا نبھاؤ سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔"

مجھے مولانا کی زبان سے یہ سُن کر بہت تعجب ہوا۔ مگر مولانا آنکھیں بند کر کے کچھ اس طرح بول رہے تھے جیسے استغراق اور وارفتگی کے عالم میں ہوں۔

کہنے لگے "سنہ ۱۹۳۰ء میں، میں نے سیاسی میدان سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر ایک تو گاندھی جی نے اصرار کیا، اور دوسرے اسی زمانے میں نمک کی ستیہ گرہ شروع ہو گئی۔ اس لئے میں نے محسوس کیا کہ ایسے موقع پر میری کنارہ کشی بہت معیوب ثابت ہو گی۔ مجھے اس وقت جیل جانے کے لئے تیار ہونا ہی تھا، اس لئے میرا فیصلہ مجبورًا معرضِ التوا میں پڑ گیا۔ یہ سلسلہ سنہ ۳۵-۱۹۳۴ء تک جاری رہا۔ جب یہ ختم ہوا تو میں نے پھر کنارہ کشی کا ارادہ کیا۔ مگر گاندھی جی نے پھر اصرار کیا اور کہا کہ ہندوستان کا جو نیا آئین آ رہا ہے۔ اس کے قصے کو ختم ہونے دیجئے، پھر علیحدہ ہو جایئے گا۔

ساتھیوں کو چھوڑ دیتے۔ اس کے بعد سے آج تک مولانا کی زندگی جیل کی چہار دیواری میں بسر ہوئی ہے۔ اس لئے سیاست سے علیحدہ ہونے یا نہ ہونیکا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر جیل سے رہا ہونے کے بعد ان کی صحت اتنی گر گئی ہے۔ کہ وہ چھپن سال کی بجائے اسی سال کے بوڑھے معلوم ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کے لئے سب سے بڑی ضرورت بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ سیاسی ہیجان و اضطراب کی دنیا سے بالکل کنارہ کش ہو جائیں۔ مگر افسوس کہ حالات کا فیصلہ کچھ اور ہے۔

اور پھر ان حالات کی سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ جو لوگ مولانا کے خلاف ہنگامے بپا کرتے ہیں۔ وہ اس فیصلے کو اور زیادہ مضبوط بنا دیتے ہیں۔ ان لوگوں کے ہنگاموں اور مظاہروں کا مدعا تو یہ ہوتا ہے کہ اس طرح مولانا تنگ آ کر کانگریس کو یا سیاست کو چھوڑ دیں گے۔ مگر جو لوگ مولانا کی فطرت سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس کا اثر ان کی طبیعت پر اور الٹا ہوتا ہے۔ حقیقت میں مولانا کی فطرت کا سب سے اہم پہلو یہ ہے۔ کہ وہ سب کچھ گوارا کر سکتے ہیں۔ مگر خطرات کے ہجوم سے بچ کر نکلنا کبھی گوارا نہیں کر سکتے۔ ان کی فطرت یہ ہے کہ اگر پیچھے سے ان پر کوئی حملہ کرے گا۔ تو بھاگنے کی بجائے الٹا اس کی طرف منہ کر کے اور سینہ تان کر کھڑے ہو جائیں گے۔ اس لئے اگر وہ سیاست کو چھوڑنے کا فیصلہ کر بھی لیں۔ تو صرف ایک ہنگامہ یا ایک مظاہرہ ان کو پھر ڈٹ جانے پر اکسا سکتا ہے۔ کشمیر میں ان کی کشتی پر جوتوں کی جو بارش ہوئی۔ اس سے بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ کہ مولانا خائف ہو گئے ہوں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی چیزیں مولانا کے عزم میں مزید ثبات و استقلال پیدا کرنے کا باعث بنتی ہیں۔

راہ کے کانٹے اور دامان تار تار

یہ نومبر ۱۹۳۸ء کی بات تھی۔ اس کے بعد اگست ۱۹۴۰ء میں ان سے میری ملاقات بمبئی میں ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب کانگریس نے وزارتوں سے استعفا دے دیا تھا۔ اور پہلی ستیہ گرہ کی مہم کا آغاز ہونے والا تھا۔

میں نے مولانا سے کہا "خدا کا شکر ہے کہ ہم ابھی تک آپ کو سیاست کے میدان میں دیکھ رہے ہیں۔"

"کیا کیا جائے، میرے بھائی"! مولانا نے متفکرانہ لہجے میں فرمایا "سیاسی گتھیوں پر گتھیاں پڑتی چلی جا رہی ہیں۔ بہرحال دیکھئے اب کیا ہوتا ہے"؟

مولانا سے اس موضوع پر زیادہ گفتگو نہیں ہوئی۔ اور نہ میں نے اس کی ضرورت سمجھی۔ کھلی بات ہے کہ مولانا جیسے انسان سے یہ قطعاً ناممکن ہے کہ وہ خطرے کے نازک وقت اپنے رفیقوں کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جائیں۔ اگر ۱۹۳۹ء میں جنگ کا اعلان نہ ہوتا اور ہندوستان کی سیاسی کشتی معمول کے مطابق چلتی رہتی تو مولانا بلا شبہ سیاست سے الگ ہٹ جاتے۔ لیکن جب اعلان جنگ کے بعد خطرات کی لہریں چاروں طرف سے دوڑنے لگیں اور ہندوستان میں ایک نازک صورت حال پیدا ہوگئی۔ تو پھر مولانا کی غیرت و حمیت سے یہ ناممکن تھا کہ ایسے موقع پر وہ اپنے

کو اپنا نصب العین بنا لیا ہے۔ اور بڑے بڑے ترقی پسند مسلمان جناح صاحب کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ پیرپور کمیٹی کی رپورٹ نے کانگرسی راج کے مظالم کی آوازوں سے سارے مسلم ہندوستان کے دل کو موہ رکھا ہے۔ ٹنڈن اور سمپورنانند کی قسم کے ہندو، ہندی کا جھنڈا ہاتھ میں لئے کانگرسی وزارتوں کے گھوڑوں پر سوار سرپٹ دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ مسلمان دور کھڑے ہوئے خوف سے لرز بھی رہے ہیں اور غصے سے بے قابو بھی ہو رہے ہیں۔ وہ مسلمان جو اب تک لیگ میں شامل نہیں ہیں۔ اور خلافت کی تحریک کے بعد سے مسلسل کانگرس کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں۔ اس حالت کو دیکھ دیکھ کر فکرمند ہو رہے ہیں۔ ان کی پوزیشن عجیب و غریب ہوتی جا رہی ہے۔ مسلمان ان سے ہندوؤں کی شکائتیں کرتے ہیں اور ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں کی شکائتوں کا ناقوس ان کے کانوں میں پھونکا جاتا ہے۔ کانگرس کے ہندوؤں کی بہت سی باتوں سے یہ بھی بددل ہیں۔ سی۔ پی میں شکلا، مہتہ اور مصرا نے وزارت کی گدیوں پر بیٹھ کر ایک نرالا کہرام مچا رکھا ہے۔ جس نے نیشنلسٹ مسلمانوں کو چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں دبا دیا ہے۔ وہ کانگرس کے رجعت پسند ہندوؤں کے شاکی ہیں۔ مگر کھل کر ان کا شکوہ زبان پر لانے سے بھی اس لئے کتراتے ہیں کہ اصلاح حال کی امیدوں سے ابھی بالکل ہاتھ نہیں دھو بیٹھے ہیں۔ مسلم لیگ کی قیادت پر اُن لیڈروں کا قبضہ ہے جو خلافت اور ترک موالات کی گزشتہ تحریکوں میں میدان چھوڑ کر بھاگ چکے تھے اس لئے ان کے پیچھے چلتے ہوئے بھی یہ ڈرتے ہیں۔

ان حالات میں گھر کر یہ سوچتے ہیں کہ اب کیا کیا جائے۔ مشکلات کا

تاہم یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ سیاسی زندگی کو چھوڑ دینے کے لئے مولانا عرصے سے بے تاب ہیں اور اب تو یہ بے تابی اتنی بڑھ گئی ہے۔ کہ غالباً اب وہ زیادہ صبر سے بھی کام نہ لے سکیں گے۔ اور پہلی فرصت میں سیاست کے لبادے کو اتار کر علم وادب کے خلوت کدے میں فروکش ہو جائیں گے تصنیف وتالیف کے سلسلے میں مولانا کے سامنے جو پروگرام ہے وہ اتنا دلکش ہے کہ اُسے سننے کے بعد میں خدا سے دعا کیا کرتا ہوں کہ وہ مبارک دن جلد آئے جب مولانا کو سیاست کے جھمیلوں سے نجات ملے اور آپ یکسوئی کے ساتھ دین ومذہب کی خدمت میں منہمک ہو کر بقراط وارسطو کی یاد ہمارے دلوں سے بھلادیں۔ اور اسلام کے اس مشکل دور میں رازی وغزالی کی یاد ایک بار پھر تازہ ہو جائے۔

اوپر کی سطور میں مولانا کی ذات کو ادب وانشاء اور خطابت وذہانت کا "جی نی اُس" یا عبقری" ظاہر کیا گیا ہے۔ اب آئیے اس سلسلے میں چند مناظر آپ کو دکھلائیں۔

عیسیٰ نفس مریض اکٹھے ہوتے ہیں

سنہ ۱۹۳۹ء کا آغاز ہے۔ کانگریسی وزارتوں کا زمانہ پورے شباب پر ہے۔ مسلمانوں کو ہندوؤں سے شکائتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ اور مسلم لیگ روز بروز طاقت پکڑتی جارہی ہے۔ ہندوؤں کے مظالم کا چرچا عام ہے۔ کہیں گائے کی قربانی پر جھگڑا ہے تو کہیں پیپل کی شاخ کاٹ دینے پر ہنگامہ بپا ہے۔ شیخ وبرہمن دست وگریبان ہیں اور سبحہ وزنّار کی آویزش کے افسانے ہر طرف مشہور ہو رہے ہیں۔ مسٹر محمد علی جناح، مسٹر کے بجائے "قائد اعظم" بن چکے ہیں۔ مسلم لیگ نے آزادی کامل

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی گھنے جنگل میں کوئی پرانی عمارت اپنی رومانی زندگی کا بھولا ہوا افسانہ یاد دلانے کے لئے کھڑی ہے۔ مگر کوٹھی کے اندر قدم رکھیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی محفل ناؤ نوش بالکل ٹھنڈی نہیں ہوئی ہے۔ مشرق و مغرب کے ملے جلے کلچر کا ایک دل پذیر نمونہ ہر طرف نظر آتا ہے۔ میز کرسیوں کے پہلو بہ پہلو قدیم مغل تہذیب کی یاد دلانے والے گدے تکئے بھی نہایت قرینے سے سجے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی ہے۔ فرش صاف ستھرا ہے۔ نوکر اگرچہ بہت کم ہیں۔ لیکن جو ہیں وہ بہت خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسی عمارت کے ایک کمرے میں دری کے فرش پر، نیشنلسٹ مسلمانوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ یہ اجتماع اخباری نامہ نگاروں کی جاسوس نگاہوں سے الگ ہٹ کر کیا گیا ہے۔ ایسوسی ایٹڈ پریس کا ایک مسلمان نمائندہ ضرور موجود ہے۔ مجلس کی بے تکلف کارروائی کی مخبری کرنے کے لئے نہیں بلکہ یہ دیکھنے کے لئے کہ مسلمانوں کا یہ ترقی پسند گروہ کیا سوچتا اور کیونکر سوچتا ہے۔ یہ نمائندہ بذات خود بھی نیشنلسٹ ہے۔ اس لئے سیاسی کارروائی میں بحیثیت ایک سیاسی کارکن کے بھی شریک ہے۔

میں بھی اگرچہ اس وقت "مدینہ" (بجنور) کی زمام ادارت ہاتھ میں لئے ہوئے تھا۔ مگر ایک اخبار نویس کی حیثیت سے نہیں۔ ایک سیاسی طالب علم کی حیثیت سے اس محفل میں شریک تھا۔ اسی طرح چند اور اخباری دوستوں کا حال تھا۔

یہ اجتماع دو تین روز تک رہا۔ اس کی حیثیت کسی باضابطہ جلسے کی نہ تھی اس لئے اس میں نہ کوئی صدر تھا اور نہ سیکرٹری۔ حاضرین کی تعداد چالیس پچاس

ایک ہی علاج ان کی سمجھ میں آتا ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے عمل سے جو جائز شکائتیں ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ یو۔پی کے یہ مسلمان سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور مولانا ابوالکلام کی رہنمائی میں مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اُجڑا ہوا رومان

یہ اجتماع جواہر لال کے آنند بھون میں ہوتا ہے۔ آنند بھون کے قریب ہی موتی لال نہرو کی وہ دوسری عظیم الشان محل نما کوٹھی ہے جو سوراج بھون کے نام سے مشہور ہے اور کانگریس کو ہمیشہ کے لئے دی جا چکی ہے۔ یہ دونوں عمارتیں ایک ہی احاطے میں واقع ہیں۔ دونوں کے بیچ میں ایک لمبا چوڑا باغ ہے جس میں اونچے اونچے درخت کھڑے ہیں۔ مگر اب اس باغ کی کیاریاں اور روشیں ہندوستان کی گلیوں اور سڑکوں کی طرح ویران پڑی ہیں۔ کوٹھی کے عین مقابل جو حصہ ہے اس کے سوا باقی سارا علاقہ کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہے۔ مگر چونکہ محل وتوع بہت عمدہ ہے۔ اس لئے بناؤ سنگار کے نہ ہونے پر بھی اس کا حسن اپنی ایک قدرتی شان دکھا رہا ہے۔ فطری حسن، مشاطہ کی صنعت گری سے محروم ہو جائے۔ تب بھی اپنی ایک نئی بہار دکھاتا ہے۔ قدِ ایاز کی زلفیں اگر سنوری ہوئی نہ ہوں تو پریشان موئی کا جادو اپنی ایک نئی شان رکھتا ہے۔ یہی حال آنند بھون اور سوراج بھون کا ہے۔ اس کی دیواریں اتنی مضبوط ہیں کہ ان پر قلعے کی دیواروں کا گمان ہوتا ہے ان کے بیرونی حصے کی قلعی دھندلی ہو چکی ہے۔ جگہ جگہ سے پلاستر بھی نکل چکا ہے باہر سے دیواریں ننگی ننگی نظر آتی ہیں۔ اور دیکھنے والے کو آثار قدیمہ کی یاد دلاتی ہیں

جسے معیار سے گرا ہوا کہا جاسکے۔ سننے والے آزادی کے ساتھ بلکہ بے باکی کے ساتھ ان پر اعتراضات کر رہے تھے۔ اور بعض دفعہ ان اعتراضات میں انتہا درجے کی سطحیت ہی نہیں مضحکہ خیزی بھی ہوتی تھی۔ مگر مولانا کے ماتھے پر ایک بل بھی کبھی کسی نے نہ دیکھا۔ وہ ہر اعتراض کو سر آنکھوں پر لیتے تھے اور پھر الفاظ کے جادو سے سب کی آنکھیں نیچی کر دیتے تھے۔ جواہر لال اور پنت مولانا کے پہلو میں بیٹھے تھے مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنی تمام صلاحیتوں اور شہرتوں کے باوجود مولانا کے سامنے ان کی زبان بولنے سے قاصر ہے۔ وہ اگر کچھ کہنا بھی چاہتے تھے۔ تو مولانا ہی اس کی وضاحت اس خوبی سے کرتے تھے کہ وہ اپنے سیاسی رفیق کی اس ادا شناسی پر حیران ہو کر رہ جاتے تھے۔

یہ داد کس نے دی؟

اس اجتماع میں ایک ایسے صاحب بھی موجود تھے۔ جو اگرچہ فرقہ پرست کے مقابلے میں نیشنلسٹ تھے۔ لیکن دراصل کچھ "نیم سرکاری" قسم کی ذہنیت کے مالک واقع ہوئے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت پر یورپ زدگی کے اثرات نمایاں تھے اور اردو علم ادب سے ان کی واقفیت کا یہ عالم تھا کہ مولانا کو محض کانگریس کا لیڈر ہونے کی حیثیت سے جانتے تھے۔ اور ان کے علمی و ادبی کارناموں سے قطعاً لاعلم تھے۔ پھر چونکہ عقیدتاً شیعہ تھے۔ اس لئے دینی حیثیت سے بھی مولانا کی عظمت کا کوئی سوال ان کے سامنے نہ تھا۔ مگر اس کے باوجود جب یہ مجلس برخاست ہوئی تو انھوں نے بڑی بے ساختگی کے ساتھ کہا:۔

"بھئی، یہ مولینا بولتا خوب ہے۔ اس کمبخت کے آگے تو برک اور شیری ڈان

کے لگ بھگ تھی اور سب ایک دوسرے کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ غرض ایک بالکل نجی صحبت تھی۔ جس میں ہر ایک کھل کر رازِ دل کہنے کے لئے گیا تھا۔ اس محفل میں مولانا ابوالکلام کے علاوہ یو۔پی کے وزیر اعظم پنڈت گووند ولبھ پنت، پنڈت جواہر لال نہرو اور کانگریس کے جنرل سیکریٹری اچاریہ کرپلانی بھی موجود تھے۔ مولانا حسین احمد اور مولانا احمد سعید جیسی مقدس ہستیاں بھی تشریف فرما تھیں۔ ان کے علاوہ یو۔پی کے وہ تمام نڈر اور ایثار پیشہ سیاسی کارکن موجود تھے جن کے کردار کی پختگی، تقریر و تحریر کی شُستگی اور علم و فضل کی بلندی کا سکہ بے شمار دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔

جو لوگ مجلسی زندگی کے گُر گھاٹ سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ اس قسم کے منتخب افراد کی صحبت میں امتیاز حاصل کرنا کتنا دشوار ہوتا ہے۔ اور در اصل ایسے ہی موقعوں پر کسی شخص کے "عبقری" یا "جی نی اس" ہونے کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ مولانا اس مجلس میں کسی ادنیٰ سی تصنع یا بناوٹ کا مظاہرہ بھی نہیں کر رہے تھے۔ اور نہ ان کی کسی ادا سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے ہم نشینوں میں سے کسی ایک کو اپنے سے فروتر سمجھ رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس محفل میں شمع محفل کی طرح نمایاں تھے۔ وہ بلبل کی طرح چہک رہے تھے اور جس طرح بلبل، برگ گل پر جھومتی ہے۔ اسی طرح حاضرین اُن کی گفتگو پر وجد کر رہے تھے۔ ان کا ہر لفظ اور ہر جملہ ناقابل تقلید تھا۔ اور انتہائی بے تکلفی و برجستگی کے ساتھ جو الفاظ ان کی زبان سے ادا ہو رہے تھے: وہ ہر لحاظ سے ادب و انشاء کا بہترین نمونہ تھے وہ گھنٹوں بیٹھے بولتے رہے۔ مگر ان کی زبان سے ایک جملہ بھی ایسا ادا نہ ہوا

ادائے بے نیازی کے ساتھ چھلکتا ہوا خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور الفاظ کے اُس سحر اور انداز بیان کے اُس جادو کا براہ راست مشاہدہ کریں۔ جو عقل سے زیادہ وجدان پر اثر انداز ہوتا ہے اور انسان کو مست و بےخود بنا کر رکھ دیتا ہے۔

آئیے آپ کے سامنے اس قسم کے ایک چشم دید شاہد کی زبان سے کچھ سنوائیں۔ یہ شاہد مولانا نصراللہ خاں عزیز مدیر "کوثر" (لاہور) ہیں۔ فرماتے ہیں:-

"امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں عشاء کے وقت مولانا تقریر کر رہے تھے۔ مجھے وجدان ہی سے نہیں۔ آنکھوں سے اس طرح محسوس ہو رہا تھا۔ گویا تقریر ایک نور کی چادر کی طرح تمام مجمع پر چھائی ہوئی ہے۔ یکایک قریب کی ایک مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی۔ خطیب تھوڑی دیر کے لئے رُک گیا۔ میں نے اس طرح محسوس کیا گویا کسی نے چادر کو چاک کر کے مجمع کے سروں پر سے کھینچ لیا ہے۔ میں نے ہندوستان کے تمام مشہور و معروف مقرروں کی تقریریں سنی ہیں۔ مگر یہ عجیب و غریب کیفیت کبھی محسوس نہیں کی۔" (دیباچہ خطبات ابوالکلام آزاد)

لیکن جن لوگوں نے مولانا کو دور و نزدیک کہیں سے نہیں دیکھا ہے۔ اُن کے دل پر مولانا کی سحر طراز شخصیت کا صحیح نقشہ بٹھا دینا اتنا ہی مشکل ہے۔ جتنا پھولوں کے تختے یا شفق کی گلگونی کو دکھائے بغیر آپ اس کی جاں نواز کیفیتوں کو کسی کے دل و دماغ میں اتارنے کی کوشش کریں۔ تاہم چونکہ ہندوستانی سیاست کے مایوس کن حالات نے مولانا کو گوشہ نشین بنا دیا ہے اور کم از کم "نئی نسل" کے لئے تو وہ ایک بالکل ہی "سنا سنایا افسانہ" ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس لئے ذیل میں مولانا کے کردار کے وہ پہلو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جو ان کے "عبقری کمال" کا جزو لاینفک ہیں۔

بھی ہوں تو مات کھا جائیں۔"

یہ تھی مولانا کی خطیبانہ جی نی اَس کے بارے میں ایک ایسے خالی الذہن بیرسٹر کی رائے، جس کے دماغ پر اردو زبان و ادب کا جادو چلانا صرف "جی نی اَس" ہی کا کام ہو سکتا ہے۔

یہ ایک واقعہ میں نے محض نمونے کے طور پر پیش کر دیا ہے، ورنہ جو لوگ مولانا سے براہ راست واسطہ رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کے سینکڑوں واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں۔ خلافت کی تحریک کے زمانے میں ایسے بہت سے موقعے آئے۔ جب مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں جیسے پختہ کار بزرگوں کی موجودگی کے باوجود، چراغ محفل کی حیثیت صرف مولانا ہی کو حاصل رہتی تھی۔ مولانا عمر میں ان حضرات سے بہت چھوٹے تھے۔ مگر بقول جواہر لال ان کا انداز کچھ ایسا ہوتا ہے کہ بڑے بوڑھے بھی ان کے سامنے خود کو چھوٹا سمجھنے لگتے ہیں۔

نور کی چادر

اگر آپ سے کوئی پوچھے کہ پھولوں کے لہلہاتے ہوئے تختے اور شفق کی دہکتی ہوئی سُرخی میں وہ کون کون سے اجزا ہیں جو دل کو موہ لینے کا سبب بنتے ہیں۔ تو آپ اس کا جواب چاہے دے لیں لیکن سُننے والے کے دل و دماغ پر وہ کیفیت طاری کرنے میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے جو پھولوں کے تختے یا شفق کی سُرخی کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام کی "جی نی اَس" کو صحیح طور سے جاننا بھی صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب آپ خطابت و شاعری کی اس بلبل ہزار داستان کو

یہاں آپ کے آنے کی اشد ضرورت ہے۔"

مولانا نے یہ سنا تو مسکرا کے فرمایا:۔ "سچ کہتے ہو، میرے بھائی، مگر جو وجہ میرے یہاں آنے کی ہے وہی نہ آنے کی ہے۔

اب آپ اس برجستہ فقرے کی بلاغت پر غور کیجئے اور سوچئے کہ ان چند الفاظ میں مولانا نے پنجاب کی سیاست اور اس سیاست پر اپنے تاثرات کے دریائے بیکراں کو کس خوبصورتی کے ساتھ کوزے میں بند کر دیا ہے۔

ایک مختصر سی صحبت میں ایک صاحب، مولانا سے کچھ الجھ رہے تھے لیکن جب بحث میں بس نہ چلا۔ تو بولے "مگر ایسی صورت میں ہندوستانی مسلمان تو آپ کو اپنا ترجمان نہیں سمجھ سکتے۔"

حملہ بڑا سخت تھا جو دوسرے سننے والوں کو بھی ناگوار گذرا، مگر مولانا کے ماتھے پر ایک شکن بھی نہ پڑی۔ بڑی خوش مذاقی کے ساتھ برجستہ بولے:۔

"سچ کہتے ہیں آپ، میں خود بھی اپنے کو مسلمانوں کا نہیں، اسلام کا ترجمان سمجھتا ہوں۔"

مولانا کے اس برجستہ جواب سے محفل میں ایک قہقہہ بلند ہوا۔ اور بحث کرنے والے صاحب کو بغلیں جھانکنے کے سوا اور کچھ بن نہ آیا۔

حال کا واقعہ ہے کہ ایک مختصر سی مجلس میں مسلم لیگ اور کانگریس کا ذکر چھڑتے ہوئے ایک صاحب نے کہا، مسلم لیگ کے رجعت پسند اور فسق و فجور میں ڈوبے ہوئے مسلمان بہرحال ہندوؤں سے اچھے ہیں۔ " پھر ذرا پرجوش مگر

دریا بہ حُباب اندر

ایک قائد و خطیب کا سب سے بڑا کمال غالباً اُس کی حاضر جوابی میں مضمر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے مولانا ابوالکلام کا پایہ اتنا بلند ہے کہ دوست رشک کرتے ہیں اور دشمن حسد سے جل مرتے ہیں۔

ایک بار دورانِ گفتگو میں نے یہ بے ڈھنگا سا سوال مولانا سے کر ڈالا۔

"آدمی بڑا کس طرح بن سکتا ہے، مولانا"؟

یہ سوال کرنے کو تو میں نے کر دیا۔ مگر معاً مجھے خیال آیا کہ میں نے کیا بے تکی سی بات کہہ دی ہے۔ مگر مولانا سنتے ہی اپنی ادائے خاص سے مسکرا کر بولے۔

"چند مشہور و معلوم سچائیاں ہیں۔ جن پر عمل کرنے سے بڑا بن جاتا ہے"

مولانا کی زبان سے اپنے سوال کے جواب میں یہ مختصر سے الفاظ سُن کر میں حیران رہ گیا۔ جو جواب ایک پوری تقریر میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مولانا نے اُسے ان بارہ لفظوں کے اندر بند کر کے رکھ دیا۔ ....

دریا کو کوزے میں بند کرنے کی اس سے بہتر مثال میرے سامنے آج تک نہیں آئی۔ آپ مولانا کے اس جملے پر غور کیجئے اور پھر دیکھیے کہ اس میں معانی کا کتنا بڑا سمندر پنہاں ہے۔ مگر ظاہراً اس کے الفاظ کی نشست کتنی مختصر سی ہے۔

برجستگی کا کمال

چند سال ہوئے جب مولانا پشاور سے واپس جاتے ہوئے لاہور سے گذرے تو اسٹیشن پر ہزاروں عقیدت مندوں نے ان کا استقبال کیا۔ ایک پُرجوش نوجوان نے دور سے چلا کے کہا: "مولانا پنجاب تشریف لائیے، پنجاب کی حالت بُری خراب ہے"

جوان کو ہندوستان کے تمام لیڈروں سے ممتاز کر دیتی ہے یہ ہے کہ وہ انتہائی ہنگامہ خیز حالات میں ٹھنڈے دل و دماغ سے واقعات کو سوچ سکتے ہیں۔ اور سخت سے سخت جذباتی ماحول میں بھی اپنے دماغ پر قابو رکھنے کا گر خوب جانتے ہیں۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ کانگریس کے ایک جلسے میں ایک صاحب (غالباً لالہ دلیش بندھو گپتا) تقریر کر رہے تھے۔ اُن کی تقریر بڑے زور و شور سے جاری تھی کہ یکایک قریب کی کسی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ یہ آواز سنتے ہی مسلمان حاضرین میں سے بعض لوگوں نے اذان کے ختم ہونے تک تقریر موقوف کر دینے کا مطالبہ کیا۔ لیکن ڈائس پر بیٹھنے والوں نے اس مطالبے پر کان نہ دھرا۔ اس پر مسلمانوں نے شور مچانا شروع کیا۔ چونکہ مسلمان حاضرین کی تعداد کافی تھی۔ اس لئے جلسے میں ایک قسم کی ابتری پیدا ہونی شروع ہوگئی۔ مگر ہندو مقرر نے بدستور اپنا زورِ بیان جاری رکھا۔ رفتہ رفتہ تقریباً سارے مسلم سامعین احتجاج میں شامل ہو گئے اور بڑی سخت جذباتی فضا جلسہ گاہ میں پیدا ہوگئی۔ اس اثنا میں اذان ختم ہوگئی۔ اور اس کے کچھ دیر بعد مقرر کی تقریر بھی پایۂ اختتام کو پہنچ گئی۔ لیکن اب ایک بہت ہی خوفناک قسم کی فضا ہال میں نظر آنے لگی تھی۔ جوش اور غصے میں بھرے ہوئے مسلمان کچھ اس طرح آپے سے باہر تھے کہ ہندو مسلم فساد اور بدامنی کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ اس موقع پر ہر مسلمان لیڈر خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ مگر مولانا بڑی سنجیدگی سے اُٹھے اور سامنے آکر بولے "میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں میں سے کوئی ایک شخص سب کا وکیل بن کر مجھ سے بات کرے۔"

مولانا کی اس درخواست پر ایک بہت نڈر قسم کے مولوی صاحب نے مسلم

طنزیہ انداز میں مولانا کی طرف دیکھ کر فرمایا:۔ مولانا' لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں اس موقعہ پر ہرقل اور معاویہ رض کا وہ واقعہ یاد کرنا چاہیئے۔ جب حضرت علی رض سے اختلاف رکھنے کے باوجود حضرت معاویہ رض نے ہرقل کے کفر کی وجہ سے اس کے مقابلے میں حضرت علی رض ہی کا ساتھ دیا تھا۔

اس اعتراض کا طنزیہ انداز لوگوں کو کچھ ایسا بھایا کہ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ مولانا لاجواب ہوجائیں گے۔ مگر مولانا نے ابرو پر بل ڈالے بغیر اپنی مخصوص خوش طبعی کے ساتھ ہنس کر کہا۔

"سوال ہندو اور مسلمان کا کب ہے میرے بھائی' سوال تو ہے ہندوستان اور انگریز کا۔ اس لئے اگر اسلامی تاریخ سے مثال تلاش کرنی ہے۔ تو مدینہ کے یہود اور مسلمان اور مکے کے کفار کے واقعے سے تلاش کیجئے۔"

اس کے بعد مولانا سنجیدہ ہو کر دیر تک اس الجھن کو صاف کرتے رہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ زبردست خود فریبی میں مبتلا ہیں جو یہ سمجھتے ہیں۔ کہ ہم گاندھی اور جواہر لال سے مل کر مسلم لیگ سے لڑ رہے ہیں۔ اس کے برعکس واقعہ صرف یہ ہے کہ ہمارے سامنے صرف انگریز کا مقابلہ ہے۔ اگر انگریز بیچ میں نہ رہے تو پھر میرے لئے ایک لمحہ کے واسطے بھی کانگریس میں کوئی جگہ نہیں ہے۔"

مولانا کی اس تفصیل آرائی پر جو پوری شان خطابت کے ساتھ کی گئی تھی۔ مجلس کا رنگ پھر بدل گیا۔

چُپ ہوجاؤ' چُپ ہوجاؤ۔

حاضر جوابی یا برجستہ فقرہ گوئی کے علاوہ مولانا کی ایک بہت اہم خصوصیت

مولانا کی اس تقریر سے مسلم حاضرین کا جوش کچھ ٹھنڈا ہوا مگر مولانا اس کے بعد رُکے نہیں، بلکہ اس کے فوراً ہی بعد لالہ دیش بندھو گپتا کی طرف رُخ کر کے بولے "لیکن اس کے ساتھ ہی میں اپنے دوست سے بھی یہ کہے بغیر نہ رہوں گا۔ کہ اخلاقی اور انسانی حیثیت سے ان کا یہ فرض تھا کہ مسلمانوں کے جذبات کی پاسداری کرتے اور اذان کے احترام میں تھوڑی دیر تک چُپ ہو جاتے"

مولانا کی اس فہمائش کو سنتے ہی لالہ دیش بندھو گپتا فوراً کھڑے ہوئے اور معذرت آمیز لہجے میں بولے "مجھے افسوس ہے کہ میرے عمل سے میرے بعض بھائیوں کو تکلیف پہنچی لیکن تقریر کے زور میں مجھے کچھ خیال نہیں رہا"

غرض اس قسم کی چند باتیں کہہ کر لالہ جی نے مسلمانوں سے معذرت چاہی اور اس طرح مولانا کی مداخلت سے ایک ناخوشگوار قضیہ حسن و خوبی کے ساتھ ختم ہو گیا۔

مولانا کی پبلک زندگی سے اس قسم کے بہت سے واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں —— نہرو رپورٹ کے زمانہ میں ایسے کئی مواقع آئے جب جلسہ گاہ میں زبردست فساد کی صورت پیدا ہو گئی اور بڑے بڑے لیڈر اپنی جانیں بچا کر بھاگنے لگے لیکن مولانا ابوالکلام کے سکون و اطمینان میں کبھی کوئی فرق کسی نے نہ دیکھا۔ ایک مرتبہ تو فسادیوں نے ایسا زور باندھا کہ اگر عین وقت پر سرحد کے چند عقیدتمند نوجوان آڑے نہ آجاتے تو مولانا کے جسم و جان کا رشتہ ہی منقطع ہو چکا ہوتا لیکن اس خطرناک صورت کے پیدا ہو جانے کے باوجود بھی دیکھنے والوں نے یہی دیکھا کہ مولانا پوری شانِ استغنا کے ساتھ اپنی جگہ پر سگرٹ کے کش لیتے رہے۔

حاضرین کی ترجمانی کے فرائض کو انجام دینا شروع کیا۔ اور انتہائی جوشیلے الفاظ میں یہ بتایا کہ اذان کے دوران میں تقریر جاری رکھ کر لالہ دلیش بندھو نے اسلام کی سخت توہین کی ہے۔

جوشیلے معترض کی تقریر کو مولانا بڑے صبر کے ساتھ سنتے رہے۔ اس کے بعد بولے :۔

" یہ بتایئے کہ اذان کا سننا شریعت کی رُو سے فرض ہے یا واجب یا سنت یا مستحب ہے "؟

" سنت نہیں تو مستحب ضرور ہے" جوشیلے معترض نے بپھر کر جواب دیا۔

" اچھا" ! مولانا نے بڑے سکون کے ساتھ کہا " اب یہ بتایئے کہ اسلام کے کسی فرض، سنت یا مستحب پر عمل کرنا مسلمانوں پر لازم ہے یا غیر مسلم بھی اس کے مکلف ہیں "؟

جوشیلے معترض نے اس کے جواب میں کچھ بے بس ہو کر کہا " عمل کرنے کی ذمہ داری تو یقیناً مسلمانوں پر ہی ہے۔ مگر........"

" بس رُک جایئے" مولانا نے بات کاٹ کر کہا " اصل یہ ہے کہ آپ اسلام کے کسی حکم کی تعمیل کا مکلف کسی غیر مسلم کو قرار نہیں دے سکتے۔ اس لئے اگر لالہ دلیش بندھو گپتا نے اذان کے وقت تقریر کو بند نہیں کیا۔ تو اس پر آپ کا چراغ پا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جب لالہ جی اسلام کے بنیادی اصول کو ہی نہیں مانتے تو آپ ان سے یہ توقع کیوں رکھتے ہیں۔ کہ وہ فرائض و واجبات سے گذر کر سنن و مستحبات کی تعمیل پر بھی سر تسلیم خم کر دیں گے۔"

مولانا کی اسی قوت حافظہ کا نتیجہ ہے کہ بولتے اور لکھتے وقت قرآن کی آیات، احادیث وفقہ کے حوالے، اکابر رجال کے مقولے اور شعرائے عرب وعجم کے کلام کے بہترین نمونے ان کی زبان اور قلم سے اس طرح ادا ہوتے ہیں۔ گویا وہ اسی موقعہ کے لئے کہے گئے ہیں۔ آپ مولانا کی کوئی تحریر اٹھا کر دیکھئے اور غور کیجئے کہ اس میں قرآن و حدیث کے جو حوالے درج ہیں، یا زور بیان کے لئے جو اشعار ثبت ہیں۔ وہ اس موقعہ پر کتنے موزوں ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوگا جیسے کسی بہترین صنعت گر نے انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیا ہو۔

خود اعتمادی کی چٹان

مولانا کی فطرت کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ وہ خود بھی اپنی صلاحیتوں کی نسبت کسی غلط فہمی میں مبتلا معلوم نہیں ہوتے۔ جس طرح ایک ہوشیار انجینئر اور ایک کامیاب مستری اپنی مشین کے ہر ہر گوشے سے واقف ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ بھی صلاحیتوں کے .... تمام گوشوں کو پوری طرح جانتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ ان میں احساس کمتری کا نام ونشان بھی نہیں۔ انھیں اپنی ذات پر اتنا زبردست اعتماد ہے کہ اس کا تصور بھی معمولی آدمی نہیں کرسکتا۔ دراصل یہی وہ خود اعتمادی ہے جس کا درس انھوں نے ۱۹۱۲ء سے دینا شروع کیا ہے اور اسی کی بنا پر وہ آج بھی مسلمان کو ہندو سے نڈر ہو کر کانگریس میں شامل ہوجانے کا سبق دیتے ہیں۔ چنانچہ ہندو مسلم اختلافات کے معاملے میں ان کی سب سے بڑی بلکہ شاید واحد دلیل یہی ہے۔ کہ:-

"ہمارے لئے شک اور خوف کی کوئی وجہ نہیں۔ ہمیں خود اعتمادی اور

حافظے کا جال

تحریر و تقریر کے میدان میں مولانا کی عظمت و بلندی کا بہت بڑا انحصار ان کی غیر معمولی قوت حافظہ پر بھی ہے۔ اس دماغی قوت کو عطا کرنے میں قدرت نے انکے ساتھ زبردست فیاضی سے کام لیا ہے۔ جس چیز کو وہ ایک بار غور سے پڑھ لیتے ہیں۔ یا جو بات ان کے دل پر گہرا اثر ڈال دیتی ہے۔ اس کی جزئیات کے تمام نقوش ان کے حافظے میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ فارسی، عربی اور اُردو کے جو اشعار ایک مرتبہ انھیں پسند آ گئے ہیں۔ وہ مرغ گرفتار کی طرح آج تک ان کے حافظے کے جال میں اسیر نظر آتے ہیں۔ اشعار کے علاوہ بیسیوں کتابوں کی عبارتیں کی عبارتیں انھیں لفظ بلفظ رٹی پڑی ہیں۔ خصوصاً حدیث و فقہ کا ذکر اگر کبھی کسی محفل میں آجائے تو:- ع

"پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ گفتار"

احادیث اور فقہ کی مستند کتابوں کی عبارتیں کی عبارتیں مولانا کی زبان سے اس طرح ادا ہوتی ہیں جیسے حافظ قرآن سے آپ قرآن سُن رہے ہوں۔ جن لوگوں کو مولانا کی قوت حافظہ کے یہ نمونے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ آج تک ان کی اس غیر معمولی صلاحیت پر انگشت بدنداں ہیں۔

کر سکتا ہے جو ایک ہی نگاہ میں میلوں کی خبر لاتا ہے؟ جس کے پاؤں میں چلنے کی سکت بھی مشکل سے پائی جاتی ہو، اس سے آپ یہ توقع کیسے رکھ سکتے ہیں کہ وہ دوڑنے والے قدموں کا ساتھ دے کر زقند بھرتا ہوا کہیں سے کہیں پہنچ سکے گا۔؟ مولانا کو اپنی ذات پر بے پناہ اعتماد ہے اس لئے ان کے سامنے کانگریس میں رہنے کی " راہ عمل بالکل صاف ہو جاتی ہے۔" اور وہ بلا شبہ یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ " ہمارے لئے شک اور خوف کی کوئی وجہ نہیں " لیکن وہ عام مسلمان جو ہندوستان کے طول و عرض میں بستے ہیں۔ اور جن کو خود اعتمادی و خود شناسی کے جوہر عطا کرنے میں مبدءِ فیاض نے اس دریا دلی سے کام نہیں لیا ہے جو مولانا کے معاملے میں صرف ہوئی ہے۔ اُن کے لئے مولانا کی یہ آواز ایک بے معنی سی آواز ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دس کروڑ مسلمانوں کی جس بھیڑ نے انہیں کل تک " امام الہند " کا لقب دے کر سر پر بٹھایا تھا وہ آج ان کی یہ باتیں سنتی ہے۔ اور سرد مہری کے ساتھ کھڑی ان کا منہ تکتی رہتی ہے۔

ہمت کی نظر سے مستقبل کو دیکھنا چاہیئے۔ اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو پھر ہماری راہ عمل بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو ایک بالکل دوسرے عالم میں پانے لگتے ہیں۔ شک، تذبذب، بے عملی اور انتظار کی درماندگیوں کی یہاں پرچھائیاں بھی نہیں پڑسکتیں یقین، عمل اور سرگرمی کا سورج یہاں کبھی نہیں ڈوب سکتا۔ وقت کا کوئی الجھاؤ، حالات کا کوئی اتار چڑھاؤ، معاملوں کی کوئی چبھن، ہمارے قدموں کا رخ نہیں بدل سکتی۔ ہمارا فرض ہو جاتا ہے۔ کہ ہندوستان کے قومی مقصد کی راہ میں قدم اٹھائے بڑھے چلے جائیں۔ میں کسی مسلمان کے لئے بشرطیکہ اس نے اسلام کی روح اپنے دل کے ایک کونے سے ڈھونڈ کر نکال نہ پھینکی ہو، یہ ممکن نہیں سمجھتا کہ اپنے کو اس کے سوا کسی اور حالت میں دیکھنا برداشت کرے۔" (ماخوذ از خطبہ صدارت رام گڑھ کانگریس ۱۹۴۰ء)

مگر بے اثر

مولانا کے یہ جملے ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلے ہیں۔ ان میں خطابت و انشاء کا جو زور ہے۔ وہ سننے والے کے دل کو کھینچ لینے کے لئے کافی ہے۔ مگر آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے باوجود مسلمانوں کے دل ان الفاظ کی طرف نہ کھنچ سکے، کیوں؟ اس "کیوں" کا صرف ایک ہی جواب ہے۔ اور وہ یہی ہے کہ قدرت کے فیاض ہاتھوں کی طرف سے مولانا کی ذات میں خود اعتمادی و خود شناسی کے جو جوہر ودیعت کئے گئے ہیں۔ وہ عام لوگوں کی دسترس سے بہت دور ہیں جس کی کمزور نگاہ دس گز سے آگے نہ دیکھ سکتی ہو۔ وہ اس تیز نظر رکھنے والے کا مقابلہ کیسے

خطوط میں کئی بار کیا ہے۔ حالانکہ مولانا کی قسم کے دوسرے بڑے لوگوں نے اس سے زیادہ تاخیر ہو جانے پر بھی ہمیشہ یہی سمجھا کہ جواب میں دو حرف لکھ دینا ہی ان کا بہت بڑا احسان ہے۔ ہمارے ملک میں "بڑے آدمیوں" کا عام قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو وہ غیر اہم سمجھتے ہیں۔ یا جنہیں اپنی اغراض کی تکمیل کا آلۂ کار نہیں بنا سکتے۔ ان سے نامہ و پیام کے روادار ہوتے ہیں۔ اور نہ خطاب و کلام کے۔ لیکن مولانا کا نقطۂ نظر اس باب میں صرف یہ ہے کہ وہ "جوہر قابل" کو دیکھتے ہیں۔ خواہ اس کی ظاہری حیثیت کتنی پست اور غیر اہم کیوں نہ ہو۔ ان کی نکتہ شناس نگاہ خطوط کے الفاظ سے لکھنے والے کے دل کی گہرائیوں کا پتہ لگا لیتی ہے۔ پھر اگر لکھنے والا "الدالخصام" کی صف میں شامل ہے ہے۔ اور اس کے دماغ کے تمام دروازے غیر جانبدارانہ بحث و نداکرے کے لئے بند ہیں۔ تب تو مولانا کامل سکوت اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے۔ تو پھر شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ جواب کے لئے ان کا قلم حرکت میں نہ آئے۔

یہ خوبی ہوئی یا کمزوری۔

مولانا کا ایک عیب یہ ہے کہ وہ بہت وسیع الحوصلہ اور بے حد فراخ دل ہیں۔ وہ اپنے حریف کی سخت سے سخت ایذا رسانی کو برداشت کر سکتے ہیں۔ اور گندہ سے گندہ گالیوں کو بے اعتنائی کے ساتھ منہ پھیر کر ٹال سکتے ہیں۔ مولانا کی اس ادا کو میں نے عیب اس لئے قرار دیا ہے کہ اس طرح وہ اُن غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں جو اُن کے حریفوں کی طرف سے عوام میں پھیلائی جاتی ہیں۔ وہ اپنے خلاف سخت سے سخت بہتان و افترا کو بڑی خاموشی سے سُن لیتے ہیں۔ اور پھر اسے ہنسی میں اڑا دیتے ہیں۔ اس معاملے میں مولانا محمد علی ان کی ضد تھے۔ مولانا محمد علی اپنے حریف کا

نہ شاخ پُر میوہ سر بزمیں

خود اعتمادی و خود شناسی کا کمال یہ ہوتا ہے کہ آدمی حلم و بُردباری اور انکساری و فروتنی کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ البتہ اس کا جذبۂ غرور اس وقت پوری شدت کے ساتھ اُبھر آتا ہے۔ جب گردن کو ٹیڑھی کر کے چلنے والے کسی مجسمۂ خود پسندی کا جذبۂ کبریائی اس کے سامنے آجائے۔ مولانا کی فطرت میں یہ جوہر پوری آب و تاب کے ساتھ پایا جاتا ہے وہ ہر شخص کے لئے سراپا عجز و انکسار ہیں۔ لیکن جب مقابلے میں کوئی ایسی طاقت آجائے جو کبر و نخوت کے نشے میں سرشار ہو، تو پھر مولانا کی "کج کلاہی" کا انداز بھی ایسا بے پناہ ہو جاتا ہے کہ دیکھنے والے حیرت کریں۔

نخوت سے جو کوئی پیش آیا　　　کج اپنی کلاہ ہم نے کر لی

ہندوستان کے اکثر بڑے آدمیوں سے ملنے اور خط و کتابت کرنے کا اتفاق مجھے ہوا ہے۔ لیکن یہ ادا میں نے مولانا ہی میں پائی کہ اگر مقررہ وقت پر ملنے میں ان کی طرف سے کچھ تاخیر ہو جائے یا کسی مجبوری کی وجہ سے مل نہ سکیں تو ایک ایسی انکساری کے ساتھ جس میں مشرقی تہذیب کی شیرینی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے، وہ عذر خواہی کرنے کی بڑی دلفریب کوشش کرتے ہیں۔ خطوط کے جواب میں تاخیر ہونے پر اپنے "شرمسار" ہونے کا بے جھجک اعتراف انھوں نے میرے کئی

سے اسے دبا لینا چاہتے تھے۔ ان کی سیاسی ناکامی میں بھی اس چیز کو بہت بڑا دخل ہے۔ لیکن مولانا آزاد کی حالت اس کے برعکس ہے۔ وہ ضبط و برداشت کے دیوتا ہیں۔ وہ انتقام لینا یا جواب دینا اپنی سب سے بڑی توہین سمجھتے ہیں۔ وہ خفا بھی ہوتے ہیں تو بے قابو ہو کر نہیں، بلکہ پوری طرح سوچ سمجھ کر۔۔۔۔۔۔

چنانچہ ستمبر ۱۹۴۰ء میں جب وہ پہلی بار مجھ پر بمبئی میں ناراض ہوئے تو مولانا محمد علی کا بارہ سال پہلے کا واقعہ پردۂ فلم کی تصویر کی طرح میرے حافظے میں تازہ ہو گیا۔

میری حالت اس وقت بڑی دلچسپ تھی۔ مولانا خفا ہو رہے تھے۔ مگر میں ایک طالب العلم کی طرح ان کی ادائے غضب کا مقابلہ مولانا محمد علی سے کر رہا تھا۔ مولانا کو خفگی اس پر تھی کہ سی۔ پی کے مشہور مقدمہ لبسوا میں مسلمانوں کے ساتھ کانگریسی وزیر اعظم شکلا کے عہد میں، اس کی خاموش رلیشہ دوانی سے جو زبردست مظالم ہوئے تھے۔ اور جس پر ناگپور ہائی کورٹ نے اپنے فیصلے میں بہت سخت ریمارک بھی دیئے تھے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے "مدینہ" میں انتہائی درشتی کے ساتھ احتجاج کیوں کیا۔ مولانا کو اس احتجاج پر اعتراض نہ تھا۔ مگر اس کے لب و لہجے میں جو خشونت تھی، اس پر وہ مجھے تنبیہ کر رہے تھے۔ ان کا سب سے بڑا اعتراض "خبیث" کے لفظ پر تھا۔ انھوں نے کہا کہ صحافت و اخبار نویسی کا ایک معیار ہوتا ہے۔ اور ایڈیٹر کی زبان کی بھی کچھ حدود ہوتی ہیں۔ جن سے تجاوز کرنا انتہائی اشتعال کی حالت میں بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔

بھولا بھائی ڈیسائی کی اس محل نما کوٹھی میں جس کے نیلے نیلے شفاف آئینوں سے پام اور رتاڑ کے لمبے لمبے حسین درختوں کے جھرمٹ میں سمندر کی لہروں کی سُریلی

پیچھا قبر تک بھی نہ چھوڑتے تھے اور اس کو زک دینے کے لئے اگر اپنی سطح سے نیچے اُترنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ تو اس سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ چنانچہ خواجہ حسن نظامی کے مقابلے میں مولانا محمد علی نے خم ٹھونک کر جو کچھ کیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج حسن نظامی جیسا "بے پناہ" انسان عوام کے سامنے بالکل بے نقاب ہے۔ لیکن اگر مولانا محمد علی کی بجائے اس کا مقابلہ ابوالکلام سے ہوتا تو میدان بلاشبہ ہمارے خواجہ گیسو دراز ہی کے ہاتھ رہتا۔

مولانا محمد علی سے جب میں پہلی بار ملا تو ریاستوں کے اسلامی وغیر اسلامی ہونے کے موضوع پر میں نے اُن سے کچھ اختلاف کیا۔ میری رائے یہ تھی کہ ہندوستان کی کسی ریاست کو اس کے مسلمان "فرمانروا" کی وجہ سے "اسلامی" کہنا صحیح نہیں ہوسکتا مولانا محمد علی میرے اس اختلاف کو برداشت نہ کرسکے اور بجلی کی سی کڑک کی طرح اس شدت سے گرجے کہ میں مرعوب بلکہ خائف ہو کر چپ ہو گیا۔ اس کے بعد میں کچھ نہ بولا۔ مگر وہ بڑی دیر تک مجھ جیسے نوجوان پر خوب برستے رہے۔

مولانا محمد علی کی یہ صحبت مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس سے ان کی فطرت کا ایک بہت بڑا پہلو میرے سامنے بے نقاب ہوا تھا۔ وہ بے حد جذباتی لیڈر تھے۔ اور ضبط و برداشت سے کام لینے کو ایک فعل عبث جانتے تھے۔ اس طرح وہ اپنے مخاطب کو مرعوب تو کر لیتے تھے مگر اسے مطمئن کرنے میں کامیاب نہ ہو سکتے تھے۔ وہ اپنے حریف کے دل کو محبت سے موہ لینے کی بجائے بزور شمشیر اسے فتح کر لینا چاہتے تھے۔ وہ ایک صوفی صاف باطن کی طرح قلعۂ دل پر صلح و آشتی کی فوجوں سے حملہ آور نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ ایک سلطان غالب کی طرح طاقت کے مظاہرے

آپ نے سوچا کہ کیا کیا جائے۔ آپ نے کہا لاؤ اسے خبیث لکھو۔"

یہ آخری فقرہ انھوں نے کچھ ایسے لہجے میں کہا کہ اس کا ظریفانہ انداز کبھی بھی میرے دماغ سے محو نہ ہوگا۔ اس کے بعد ملاقات ختم ہو گئی۔ مگر جب مولانا سے جدا ہوا تو غصے کی کیفیت کا کوئی ادنیٰ سا شائبہ بھی موجود نہ تھا۔ مولانا نے آخر میں مزاح و ظرافت کی ایک ایسی فضا پیدا کر دی جس نے میرے دل سے ان کے غضبناک الفاظ کی ہر خلش کو نکال ڈالا۔

مولانا کے اس کمال کی تقلید کرنے کی کوشش اپنے دوستوں پر میں نے دو ایک بار کی۔ مگر مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ البتہ اس تجربے سے میرے دل میں مولانا کے "عبقری" ہونے کے علاوہ اپنے "غیر عبقری" ہونے کا جو احساس پیدا ہوا اس پر مجھے بڑا طیش آیا۔ مگر طیش سے کیا ہوتا ہے۔

قہرِ درویش برجانِ درویش

آوازیں دل و دماغ کو مسحور کر دینے کے لئے کافی ہوتی ہیں ۔ مولانا کے عتاب کی یہ بجلیاں مجھ پر گر رہی تھیں ۔ میں نے جواب دینے کی کوشش نہ کی ۔ البتہ جب وہ بہت کچھ کہہ چکے تو میں نے صرف اتنا کہا ۔

"مولانا! میں اپنی صفائی پیش کرنا نہیں چاہتا ۔ لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا۔ کہ ایک اخبار نویس کی حیثیت سے ہماری حالت آپ جیسے حضرات سے مختلف ہے ۔ آپ کسی واقعہ پر سکوت اختیار فرما سکتے ہیں ۔ لیکن ہم ایسا نہیں کر سکتے ۔"مدینہ" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے مجھے بہر صورت ہر تیسرے روز وقت کے ان موضوعوں پر کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا ہے ۔ جو عوام کے دل و دماغ میں کھٹکتے رہتے ہیں ۔"

میرے پورے جملے ابھی ختم بھی نہ ہونے پائے تھے کہ مولانا میرا نقطۂ نظر پوری طرح سمجھ گئے اور اپنی عادت کے مطابق اسے اپنے الفاظ میں اس طرح دہرایا گویا وہ میری ترجمانی کے فرائض انجام دے رہے ہیں ۔ پھر فرمایا :-

"یہ بات صحیح ہے مولوی صاحب ۔" ! "میرے بھائی" کی طرح "مولوی صاحب" کا لفظ بھی وہ اپنے مخاطب کے لئے اکثر استعمال کرتے ہیں ۔ خواہ مولویت کی کوئی ادا اس میں ہو یا نہ ہو) اس کے بعد ذرا تبسم کے ساتھ بولے "اور یہ بھی صحیح ہے کہ شکلا کے خلاف آپ کے جذبات بھی حق بجانب ہیں ۔ بات واقعی صحیح ہے ۔ لیکن میرا اعتراض لب و لہجے پر ہے ۔"

اب مولانا نے اپنا انداز کلام بدل دیا اور ظرافت کا لہجہ اختیار کر کے بات کو کچھ ایسا چکر دیا ۔ کہ میں بھی مولانا کے ساتھ ہنسی میں شریک ہو گیا ۔ کہنے لگے :-
آپ کی نفسی کیفیت کو میں سمجھتا ہوں ۔ آپ کو شکلا کی حرکت پر بے حد غصہ آیا ۔ مگر

کوشش کی ہے۔ گاندھی جی کا یہ داؤں اتنا کامیاب ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی وہ اس سے چت کر لیتے ہیں۔ پھر چونکہ مولانا کی سب سے بڑی "کمزوری" یہ ہے کہ وہ ہمیشہ وسیع القلبی کے ساتھ غیر جانبدار ہو کر چیزوں پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے وہ دوسرے کی بات کو کھلے دماغ سے سنتے ہیں۔ اور اگر کوئی بات ان کی سمجھ میں آ جائے تو فوراً ہی اسے مان لیتے ہیں لیکن گاندھی جی پہلے سے ایک بات طے کر لیتے ہیں اور پھر تمام دوستوں اور معترضوں کی بات ایک ناطرفدار جج کی خاطر نہیں بلکہ فریق مخالف کے ایک وکیل کی طرح سنتے ہیں۔ وہ ایک ایسے ریسرچ اسٹوڈنٹ ہیں جو اپنی ریسرچ کا نتیجہ پہلے سے طے کر لیتا ہے۔ اور پھر اس نتیجے کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے مواد فراہم کرتا ہے۔ لیکن مولانا آزاد کا حال اس کے برعکس ہے۔ وہ ایک خالی ذہن لے کر ریسرچ کرتے ہیں۔ اور اپنے تاثرات کے خلاف بھی اگر کوئی نتیجہ نکل آئے تو اسے مان لینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گاندھی جی اپنی ذہانت و فطانت سے اکثر اپنی بات تو ان سے منوا لیتے ہیں۔ مگر خود ان کی بات کو شاذو نادر ہی کبھی مانتے ہیں۔

گاندھی جی کی اس فطرت کا احساس یوں تو مجھے بہت دنوں سے تھا۔ مگر اس علم الیقین کو عین الیقین کا درجہ ایک خاص موقعہ پر حاصل ہوا۔ ستمبر ۱۹۴۰ء میں سی۔پی کے مقدمۂ لبسوا کے ملزموں کو ناگپور ہائی کورٹ نے بری کرتے ہوئے وزیراعظم شکلا اور ان کے ساتھیوں کے خلاف نہایت سنگین الزامات لگائے تھے۔ اس پر مسٹر فضل الحق نے جو اس وقت بنگال کے وزیراعظم تھے فوراً ہی ایک ملامتی بیان کانگریس کے خلاف شائع کر دیا تھا۔ گاندھی جی نے اس بیان کا جواب دیتے ہوئے کانگریس کی طرف سے

گاندھی اور ابوالکلام

جس طرح چند فقرے سنتے ہی مولانا پوری بات کی تہ تک پہونچ جاتے ہیں۔
اسی طرح کسی شخص کے ملنے کے بعد وہ بڑی تیزی کے ساتھ اس کے دل کی گہرائیوں
کو تاڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنے دوستوں اور معتقدوں کا انتخاب کرنے میں بہت کم غلطی
کرتے ہیں۔ کانگریسی لیڈروں میں انھوں نے اپنی دوستی کے لئے گاندھی کے بعد
جواہر لال اور بھولا بھائی ڈیسائی کو پسند کیا ہے۔ گاندھی جی بھی ان پر بے حد بھروسہ
کرتے ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ باہمی اعتماد و دوستی کی اس اسپرٹ سے نفع میں ہمیشہ
گاندھی جی ہی رہتے ہوں گے۔ گاندھی جی میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنے مطلب
کو کبھی نہیں بھولتے مگر اسی کے ساتھ جوش میں آ کر کبھی کچھ نہیں کہتے۔ وہ اپنی مرضی کے
خلاف کسی چیز کو دیکھ کر ردّ تو کر سکتے ہیں۔ مگر غصہ نہیں کر سکتے۔ اُن کی بے کسی کا یہی
مظاہرہ درحقیقت ان کے دوستوں کو سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے۔ اور یہی
صفت ان کی کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت ہے وہ اپنے مخالف کی سخت سے
سخت بات بہت مسکین بن کر سن لیتے ہیں۔ آپ انھیں ڈانٹتے رہیئے اور وہ بھیگی
بلّی بنے چپ چاپ سنتے رہیں گے۔ مگر آخر میں کریں گے وہی جسے پسند کرتے ہیں۔
تاہم آپ پر یہ اثر ضرور ڈال دیں گے کہ انھوں نے آپ کی بات ماننے کی پوری

کرو، ویسا ہی فتویٰ وہ دیدیتے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کا مطلب اس سے یہ تھا کہ سمپورنانند جی نے اپنے ڈھب کی باتیں پیش کرکے گاندھی جی سے اپنی من مانی بات کہلوائی ہے لیکن یہ بات غلط تھی گاندھی جی کبھی بھی کوئی ایسی بات نہیں کہتے جسے وہ کہنا نہیں چاہتے یا جو ان کی پہلے سے طے کی ہوئی پالیسی کے خلاف ہوتی ہے۔ لکھنؤ کے مدح صحابہ اور تبرے کی تحریک کے موقع پر لوگوں نے بہت چاہا کہ کسی طرح ان سے یہ کہلوائیں کہ اپنے پیشواؤں کی تعریف کرنا ہر شخص کا قدرتی حق ہے۔ مگر چونکہ وہ اس بحث میں شیعوں کی مخالفت کرنی نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے آخر وقت تک اس سیدھی سی بات کے کہنے سے کتراتے رہے۔

گاندھی جی کی ایک خاص صفت

غرض گاندھی جی اپنی اس صفت کی وجہ سے مولانا آزاد کی رائے کو ہمیشہ یا تو اپنی مرضی کے مطابق بنا لیتے ہیں۔ اور یا اسے اس طرح نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کہ مولانا ان پر غصہ نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کی صحبت نے غالباً گاندھی جی کی رائے کو اتنا متاثر نہیں کیا۔ جتنا خود مولانا ان کی رائے سے متاثر ہوئے ہیں۔ البتہ جواہر لال اور بھولا بھائی ڈیسائی کو انھوں نے کافی اثر پذیر بنایا ہے۔ جواہر لال کی حالت گاندھی جی کی طرح بالکل نہیں ہے۔ وہ واقعی کھلے دماغ سے چیزوں کو سوچتا ہے۔ اور مولانا کی کوئی معقول بات اگر اس کی سمجھ میں آجائے تو پھر ہندو دھرم یا گئو رکھشا کی قسم کے سوالات اس کے فیصلوں میں مزاحم نہیں ہوتے۔ مگر چونکہ سکہ گاندھی کے نام کا چلتا ہے۔ اس لئے جواہر لال جیسے لیڈروں کی رائے کچھ زیادہ موثر نہیں ہوتی۔

جو صفائی پیش کی تھی ۔ اس میں کھلی جانبداری کی بو آتی تھی ۔ اتفاق سے اسی زمانے میں واردھا میں گاندھی جی سے میری ملاقات ہوئی ۔ میں نے سب سے پہلے یہی سوال اٹھایا ۔ مگر انھوں نے پھر بھی اپنے بیان کی تائید ہی کی ۔ بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر بولے "میں تو فضل الحق صاحب کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا ۔ اس لئے میں نے بیان میں بہت سی باتیں نہیں لکھیں ۔ ورنہ اصل میں اس قسم کی چیزوں میں سب سے بڑی چیز قانونی شعور ہوا کرتا ہے ۔ اور فضل الحق صاحب نے جو بیان دیا ہے ۔ اس میں یہ قانونی شعور نہیں ہے "

مجھے یہ سن کر اور بھی تکلیف ہوئی ۔ اس وقت گاندھی جی کے پاس ڈاکٹر سید محمود بھی بیٹھے تھے ۔ میں نے ان کی طرف دیکھا مگر وہ کچھ نہ بولے ۔

اسی زمانے میں یو۔پی کی کانگریسی وزارت کے وزیر تعلیم مسٹر سمپورنانند نے ایک بیان شائع کیا تھا ۔ کہ ہندی میں سنسکرت کے الفاظ کی بہتات ہونی چاہیئے اور گاندھی جی نے اپنے ایک خط میں اس کی تائید کی تھی ۔ میں نے اس کا تذکرہ جب ان سے کیا تو وہ ڈاکٹر محمود کی طرف مخاطب ہو کر بولے "کہیئے ڈاکٹر صاحب، کیا اس بیان میں میں نے کوئی غلطی کی تھی "؟

ڈاکٹر صاحب اس وقت بحث کرنے کے لئے تیار نہ تھے ۔ اور سب سے بڑی بات غالباً یہ تھی کہ وہ میرے مقابلے میں گاندھی جی کی مخالفت بھی کرنا نہ چاہتے ہوں گے ۔ اس لئے انھوں نے کچھ گول مول سے لفظوں میں ایسا جواب دیا جس سے دونوں کی بات رہ جائے ۔ مجھ سے کہنے لگے "بھئی، گاندھی جی کے اس خط کی حیثیت تو ایسی تھی جیسے مولویوں کے فتوے کی ہوتی ہے جیسے واقعات تم ان کے سامنے پیش

مولانا کی سیاست چند جملوں میں

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مولانا کانگریس میں صرف گاندھی کی دوستی کی وجہ سے ہیں۔ اس کے برعکس ایمانداری کے ساتھ وہ اپنی اس حیثیت کو صحیح سمجھتے ہیں۔ میں نے کئی بار اس مسئلے پر ان سے کافی بحث کی ہے اور ان کے دلائل کا ماحصل یہی رہا ہے کہ:۔

۱۔ ہندوستان کا پہلا اور بنیادی سوال صرف یہ ہے کہ انگریز کے اقتدار سے کامل آزادی حاصل کی جائے۔

۲۔ یہ چیز ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ممکن نہیں۔

۳۔ کانگریس سے علیحدہ ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ جواہر لال کی قسم کے لوگوں کو بھی ٹنڈن اور سمپورنانند بنا دیا جائے۔ جس سے ہندوستان کی آزادی کا مقصد ایک موہوم خواب ہو کر رہ جائے گا۔

۴۔ گاندھی اور جواہر لال وغیرہ کی دوستی سے متعصب اور تنگ نظر قسم کے ہندوؤں کی زہر افشانی کو جتنا بھی کم کیا جا سکے۔ اتنا ہی ہندوستان اور مسلمان دونوں کے لئے مفید ہے۔

اور بیچارے بھولا بھائی ڈیسائی تو خیر کسی گنتی شمار ہی میں نہیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کانگریس کے اونچے لیڈروں کے حلقے میں مولانا کی موجودگی سے بہت سی باتیں ہونی بھی ہیں۔ اور بہت سے فتنے رکتے بھی ہیں۔ حد یہ ہے کہ ٹنڈن اور سمپورنانند قسم کے لیڈر تو ان سے بے حد جلتے ہیں اور خدا سے چاہتے ہیں۔ کہ مولانا کانگریس سے الگ ہو جائیں لیکن گاندھی میں ایک خاص خوبی (جسے ہند و حضرات کمزوری سے تعبیر کرتے ہیں) یہ ہے کہ وہ اپنے دوستوں کا بڑا وفادار ہے۔ وہ ہر قیمت پر دوستوں کی دوستی نباہتا ہے۔ اس لئے مولانا آزاد کی رائے سے چاہے اسے کتنا ہی اختلاف ہو۔ لیکن ان کی ذات سے اس کی محبت و وابستگی یقیناً نمائش و تکلف کے ہر جذبے سے پاک ہے۔ اور دراصل یہی وہ محرک ہے جس کی بنا پر مولانا آج تک کانگریس کے ایوان میں نظر آرہے ہیں۔ ورنہ وہ تو کبھی کے سیاست سے کنارہ کش ہو کر صرف تصنیف و تالیف میں منہمک ہو کر رہ جاتے۔

گاندھی کی دوستی نے مسلمانوں سے خطابت و انشا کا ایک بے مثال عبقری چھین لیا ہے۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ دوستی کا یہ سحر کب تک مولانا کو مسحور رکھے گا۔

وہ کہتے ہیں :۔ مسلمانوں میں کیرکٹر نہیں رہا۔ اگر یہ آجائے تو آج بھی نقشہ بدل جائے۔ ؎

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا ؛ آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

میں نے کہا :۔ آپ کو پاکستان پر کیا اعتراض ہے ۔؟

بولے :۔ اس وقت اس سوال کو کھڑا کرنے سے انگریز کو مدد ملے گی ۔ ہاں ہندوستان کی آزادی کے بعد اگر مسلمان چاہیں تو پاکستان بنا لیں زیادہ سے زیادہ اس وقت ہندوؤں سے یہ منوا لیں کہ آزادی کے بعد وہ پاکستان بنانے میں آزاد ہوں گے ۔

اس کے بعد فرمایا :۔ آخر مسلمان پاکستان چاہتے کیوں ہیں ؟ اسی لئے تاکہ اس طرح مسلمانوں کی بھلائی کی بہترین شکل ان کے نزدیک حاصل ہو سکتی ہے ۔

"جی ہاں" میں نے فوراً تصدیق کی ۔

پھر اگر یہ مقصد پاکستان سے بھی زیادہ بہتر طریقے پر کسی اور شکل سے حاصل ہو جائے تو کیا تم اسے پسند نہ کرو گے ۔؟ اس لئے تم ابھی سے ہر قسم کی گفت و شنید کا دروازہ کیوں بند کئے دیتے ہو ؟ پاکستان تو بہر صورت ہندوستان کی آزادی کے بعد ہی بنے گا ۔ اس لئے پہلے آزادی کا مسئلہ تو طے کر لو، اس کے بعد پاکستان کا مسئلہ بھی طے کر لینا ۔

میں نے کہا :۔ ہندوؤں کی ذہنیت کلچرل معاملات میں بہت رجعت

ان تمام دلائل کو سننے کے بعد میں ان سے کہتا تھا کہ "مگر مسلمان تو آپ کی اس آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے"

میرے اس اعتراض کے جواب میں مولانا کا ارشاد یہ ہوتا تھا "حق بات کہے چلے جاؤ۔ چاہے سننے والا ایک بھی نہ ہو"

وہ فرماتے ہیں۔ ہندوستان جاہلوں کا ملک ہے۔ یہاں سیاست کا نقطہ کسی اصول پر مبنی نہیں ہوتا۔ بلکہ وقتی ہنگاموں کو سیاست کا جامہ پہنا کر کچھ لوگ اپنی لیڈری کی دکانیں چمکا لیتے ہیں۔ اس چیز کے ثبوت میں وہ مسجد شہید گنج، شاردا بل، شدھی، سنگھٹن اور مدح صحابہ و تبرا کی شورشوں کو پیش کیا کرتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں :۔ میں نے جو فیصلہ ۱۹۱۲ء میں الہلال اور البلاغ کی ادارت کے وقت کیا تھا اسی پر آج بھی قائم ہوں۔ ہندو جیسے جب تھے ویسے ہی اب بھی ہیں۔ اور میں بھی جیسا اس وقت تھا۔ وہی آج بھی ہوں۔ مگر مسلمان بدل گئے ہیں۔ ؎

نمی دانم ترا در دل چہ افتاد   کہ کردی صحبت دیرینہ برباد

میں نے کہا :۔ اگر ہندوستان کو آزادی مل جائے اور یہاں جمہوری اصول پر حکومت قائم ہو جائے تو مسلمان ہندوؤں کے زیر اثر ہو جائیں گے۔

مگر مولانا کہتے ہیں :۔ ہرگز نہیں، اصل چیز یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنی ذات پر اعتماد اور اپنی طاقت پر بھروسہ ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو پھر کوئی چیز بھی انھیں تباہی و بربادی سے نہیں بچا سکتی۔ لیکن اگر ہے تو پھر ہندوؤں کا بڑے سے بڑا سنگھٹن بھی انھیں تباہ نہیں کر سکتا۔

ہونے کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں۔ کہ ہم ہندوؤں کے رحم وکرم پر جئیں۔ اسی لئے تو میں تحفظات اور سمجھوتوں کا کبھی قائل نہیں۔ میں تو سب سے بڑا سمجھوتہ اور سب سے بڑا تحفظ خود اعتمادی کو سمجھتا ہوں۔ میں تو مسلمان سے یہ کہتا ہوں کہ اپنی ذات پر بھروسہ کرو اور آگے بڑھ کر ہندو سے کہو۔ کہ آؤ ہم تم دونوں مل کر انگریز کے ہاتھ سے اقتدار چھین لیں۔ پھر اگر ہندو کے قدم تمہاری آواز پر آگے نہ بڑھیں تو تم تنہا ہی آگے بڑھے جاؤ۔ لیکن ہندو آتا ہے اس لئے ہم اس کے ساتھ ہیں۔ آزادی کا پروگرام اس کا نہیں، ہمارا ہے۔ ہم اس معاملے میں کسی کے تابع نہیں، صرف اپنے ضمیر کے تابع ہیں۔ لیکن اگر مسلمان ہندو کو ساتھ لے کر انگریز کے مقابلے میں نہ آئیں۔ بلکہ ہندو سے اپنے حقوق مانگنا شروع کردیں۔ تب البتہ ہم نہ صرف ہندو کے دست نگر ہو جاتے ہیں۔ بلکہ انگریز کے آگے بھی دامن پسار کر لطف وعنایت کی اپیل کرتے ہیں۔ لیکن میں نہ ہندو سے کچھ مانگنا چاہتا ہوں نہ انگریز سے۔ ؎

مرا از شکستن چنیں عار ناید ÷ کہ از دیگراں خواستن مومیائی

"پھر آپ ان چیزوں کو مسلم عوام کے سامنے کیوں نہیں لاتے۔ ؟ وہ تو ان دلائل سے بالکل بے خبر ہیں"۔؟ میں نے مولانا سے کہا۔

اس پر انھوں نے کہا۔ "انگریزی اقتدار کی پیہم شرانگیزیوں نے حالات اتنے بگاڑ دیئے ہیں کہ مسلمانوں میں خود اعتمادی کا جذبہ ہی مفقود ہو گیا ہے۔ اس لئے جب وہ زمین ہی باقی نہ رہی جس پر کھیتی کرنا ہے۔ تو تخم پاشی کہاں کی جائے۔ تاہم مجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے۔ میں کرتا رہتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ تاکہ جب مستقبل کا مورخ

پسندانہ ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبے پر پراچین بھارت کے نام سے ہزار سال پیچھے کا نقشہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

بولے :- میں اسے خوب سمجھتا ہوں۔ یہ کوئی انکشاف نہیں ہے۔ میں اچھی طرح محسوس کرتا ہوں کہ ہندوؤں میں صحیح قومی احساس پیدا نہیں ہوا ہے۔

" پھر آپ یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے " ؟ میں نے پوچھا۔

" کریں گے اور ضرور کریں گے۔ مگر سیاسی مسائل کے جھمیلوں سے نجات تو ملے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ گذشتہ بیس پچیس برس سے برابر پولٹیکل سوالات اس شدت سے پیدا ہو رہے ہیں۔ کہ ہم ان سے یکسو ہو کر کلچرل مسائل کی طرف متوجہ ہی نہیں ہو سکتے۔ مگر ہم اس طرف سے غافل نہیں ہیں۔ جب بھی موقعہ ملے گا۔ ہم ہندوؤں کے دماغ سے پراچین بھارت کی لغویت کو نکالے بغیر نہ رہیں گے۔ پھر اگر وہ اس کے لئے تیار نہ ہوئے تو یقیناً مسلمان ہندوستان سے کٹ کر اپنا پاکستان علیحدہ بنالیں۔ لیکن ایک بار کوشش تو کر دیکھیں۔ یہ قبل از مرگ واویلا والی بات تو ٹھیک نہیں "۔

میں نے انہیں یاد دلایا کہ :- " الہلال والبلاغ کے صفحات سے آپ نے یہ اعلان کیا تھا کہ ہمیں نہ ہندوؤں پر بھروسہ کرنا چاہیئے نہ انگریز پر، بلکہ خود اپنی ذات پر۔ لیکن کانگرس کے ماتحت رہ کر تو ہم ہندوؤں کے دست نگر ہو جاتے ہیں " ؟

بولے :- میں اب بھی وہی کہتا ہوں جو پہلے کہتا تھا۔ کانگرس میں شریک

کام کرنے کی استعداد کے لحاظ سے گاندھی سے اس کو کوئی نسبت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۱۹ء کا مہاتما آج بھی مہاتما ہے۔ لیکن ۱۹۱۹ء کے امام الہند کو آج "شو بوائے" تک کہنے سے مسلمان نہیں چوکتے۔ اگر مولانا میں یہ کمزوری نہ ہوتی تو آج وہ دنیائے انسانیت کی عظیم الشان شخصیت ہوتے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کی لکھے تو اسے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر نہ آئے اور ہندوستان میں اسلامی تاریخ کے ہر ورق پر سیاہی ہی سیاہی کے دھبے نہ ہوں کہیں سے تو روشنی کی کوئی کرن پھوٹتی ہوئی دکھائی دے ۔

غرض یہ ہیں اس "عبقری" کی فطرت کی چند جھلکیاں جسے زمانہ صدیوں میں کبھی پیدا کرتا ہے ۔ مگر جسے آج مسلمان صحیح رنگ میں دیکھنے سے قاصر ہیں ۔

کئی نہیں کئی ہزار دماغ

مولانا امین احسن اصلاحی سے (جو آج کل مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریک اسلامیت (پٹھان کوٹ) کے داعی ہیں) ایک بار مولانا آزاد کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا تھا:۔

"ان کا دماغ کئی دماغوں کو نچوڑ کر بنایا گیا ہے ۔"

اس پر انھوں نے فرمایا :۔ کئی نہیں ، کئی ہزار دماغ کہیے ۔"

حقیقت یہ ہے کہ مولانا امین احسن صاحب کی یہ رائے مولانا آزاد کی عبقریت کا بہت ہی صحیح نقشہ پیش کرتی ہے ۔ مولانا امین صاحب کو اُن کی سیاسی رائے سے اختلاف ہے ۔ مگر ایک دیانتدار ناقد کی حیثیت سے وہ ان کے کمالات کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے ۔

مولانا امین صاحب کا یہ جملہ ابوالکلام کی بہترین تنقید ہے ۔ مگر افسوس یہی ہے ۔ کہ غور و فکر اور خطابت اور انشار کا یہ شہسوار عوام میں گھس کر ان تھک جدوجہد کرنے کی قابلیتیں لے کر پیدا نہیں ہوا ۔ وہ تدبر و نکتہ سنجی کے میدان میں گاندھی سے کہیں اونچا ہے ۔ مگر عوام کی ذہنیت کے مطابق اپنی سطح سے کچھ نیچے اُتر کر ان میں

جز و بنیادی ہیں ۔ اگر "قائداعظم" کی تربیت یورپ کے بجائے ہندوستان میں ہوئی ہوتی اور وہ عربی فارسی سے بے بہرہ نہ ہوتے تو آج ابوالکلام کی قدر پہچانتے اور اس گوہر بے بہا کو قوم کے تاج افتخار کا طرۂ امتیاز بنانے کی کوشش کرتے لیکن انھوں نے اس کے بجائے یہ چاہا کہ مولانا کو کاٹ کر پھینک دیں ۔ ایک حریف کی طرح انھوں نے مولانا سے انتقام لینا چاہا ۔ مولانا اس میدان کے شہسوار نہ تھے اس لئے وہ چپ ہو گئے ۔ "قائداعظم" سمجھ رہے ہیں کہ انھوں نے مولانا کو زیر کر لیا لیکن ان کا یہ سمجھنا غلط ہی نہیں ہے ۔ پوری مسلم قوم کی بد نصیبی ہے ۔ مسلم کلچر اور اسلامی تہذیب کی حفاظت کا دعویٰ کرنے والے لیڈر اگر اسلامی روح کا ذرا سا جوہر بھی رکھتے تو آزاد کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ، اور وہ جہاں کہیں بھی ہوتا اسے اپنی نگاہوں کا مرکز بناتے وہ ہیرا ہے جس کی چمک سے سارا ماحول چمک سکتا ہے ۔ وہ کندن ہے جو ہر کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے ——— مگر وائے بد نصیبی کہ ہم دنیا کی اس عظیم الشان شخصیت کی صفات کو اس وقت یاد کریں گے جب دنیا میں اس کی صرف یاد باقی رہ جائے گی ۔ ہماری آئندہ نسلیں اس وقت روئیں گی مگر اسے کہیں نہ پاسکیں گی ۔ آج ہم اپنے دامن سے اپنی گراں بہا متاع کو پھینک رہے ہیں ۔ مگر کل جب ہم اس پر آنسو بہائیں گے تو اپنی اس غلطی کی کوئی تلافی نہ کرسکیں گے ۔

کاش قائداعظم کو کوئی بتا سکتا کہ ابوالکلام کا مقام کیا ہے ۔ وہ عربی نہیں جانتے اس لئے ابوالکلام کو کیسے جان سکتے ہیں ۔ وہ اردو سے نابلد ہیں اس لئے ابوالکلام کی فطرت میں عشق اسلام کی جو تڑپتی ہوئی چنگاریاں ہیں اسے کیسے دیکھ سکتے ہیں ۔ ان کی تربیت اور تعلیم یورپ میں ہوئی ہے ۔ اس لئے مشرق کی گود میں

قائد اعظم اور مولینا آزاد

آج مسلمان مولانا کو نہیں پہچانتے۔ وہ اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گئے ہیں۔ فرانس کی جون آف آرک کی طرح اگر آج مسلمان ان کی توہین و تذلیل کرتے ہیں تو مقام حیرت نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ شاید "شو بوائے" کی پھبتی کس کر یا "مولانا ہا ہا" کا فقرہ چست کر کے ہم انھیں دبا سکتے ہیں۔ مگر کاش ہمیں یہ معلوم ہوتا، کہ اس قسم کی مخالفتیں ایک "عبقری جوہر" کو اپنے عزم وارادے میں اور زیادہ پختہ کر دیتی ہیں۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ مولانا شاید کانگریس سے علیحدہ ہو جاتے بلکہ شاید وہ لیگ کی تائید بھی کرنے لگتے۔ لیکن جناح صاحب کے ایک لفظ "شو بوائے" نے وہ کام کیا ہے جو بڑے سے بڑے زہریلے تیر نہیں کر سکتے۔ مولانا جیسی شخصیت جان سے ہاتھ دھو سکتی ہے لیکن محمد علی جناح جیسے انسان کی دھمکیوں سے متاثر ہو کر اپنی رائے نہیں بدل سکتی۔ جناح صاحب سیاست کے گُر گھاٹ سے خوب واقف ہیں۔ اس لئے اس میدان میں وہ مولانا کو یقیناً شکست دے سکتے ہیں اور دے چکے ہیں۔ مگر وہ مولانا کو مرعوب نہیں کر سکتے اور نہ ان صفات کو ہمیشہ کے لئے دھندلا کر سکتے ہیں۔ جو قدرت کے ہاتھ نے مولانا آزاد کی فطرت کا

پلے ہوئے اس "مرد کامل" کے جوہر کو کیسے پہچان سکتے ہیں۔ لیکن کیا ہندوستان کے طول و عرض میں کوئی ایک بھی صاحب دل ایسا نہیں جو "قائد اعظم" کو ابوالکلام کا مرتبہ بنا سکے۔ اور جو مسلم قوم پر یہ احسان کر سکے کہ وہ انھیں بتائے کہ ملّت اسلامیہ کا یہ چراغ اور ہندوستانی مسلمانوں کا یہ سرمایۂ نازش ہمارے مستقبل کی تاریکیوں کو دور کرنے میں کیا کچھ کر سکتا ہے ——— !!

آہ ——— ! ایک صدا جو صحرا میں بلند ہو رہی ہے ——— !!

شاہدے در میانِ کوران است !

مصحفے در میانِ زندیقاں !